# بزم آرائیاں

محمد خان

# بزم آرائیاں

کرنل محمد خان

## انتساب

ان دوستوں کے نام

جن کے

پیار سے طبیعت نے

زیست کا مزا پایا

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

غالب

# فہرست

# پیش لفظ

## نام میں کیا رکھا ہے؟

فرمایا جناب ولیم شیکسپیئر نے: ”نام میں کیا رکھا ہے؟ گلاب کو جس نام سے بھی پکارو وہی پیاری خوشبو دیگا۔“ ٹھیک ہے مگر خوشبو کے پہنچنے سے پہلے گلاب کو دیکھنے بلکہ اسے گلاب کہنے میں ایک علیحدہ مزہ ہے۔ ذرا گلاب کو مولی کہہ کر تو دیکھیں۔ یا شیکسپیئر کو شیکنائف Shakenife کہہ کر تو پکاریں! سو نام میں کچھ تو رکھا ہے۔ اس کتاب کا نام بزم آرائیاں اس لئے ہے کہ اسکے بیشتر مندرجات کا مزاج بزمیہ سا ہے اور جب بھی وہ واقعات جن کے گرد یہ کہانیاں بُنی گئیں، یاد آتے ہیں تو معاً غالب کا شعر ذہن میں ابھرتا ہے:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

اللہ کا شکر ہے کہ دوسرے مصرع کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا اگرچہ شروع یقیناً ہو چکا ہے بہرحال خوشی اس بات کی ہے کہ اس شعر نے اپنی ایک خوبصورت ترکیب ۔۔۔ بزم آرائیاں ۔۔۔ کی شکل میں اس کتاب کو نام دیا ہے۔ غالب سے یہ تبرّک ہمیں کتنا عزیز ہے کچھ نہ پوچھئے۔

اس کتاب[1] میں تین قسم کے مضامین ہیں: عشقسانے، انشائیے اور مصنّف بیتی

---

[1] کتاب کے نام کے سلسلے میں ایک عجیب لطیفہ ہوا۔ ایک اعلیٰ سطح کی محفل میں میرِ مجلس مجھ سے پوچھ بیٹھے "سنا ہے تمہاری نئی کتاب آ رہی ہے۔ کیا نام ہے؟: عرض کیا "بزم آرائیاں"۔ پاس ہی یار طناز و خوش آواز مختار مسعود بیٹھے تھے۔ برجستہ بولے "ماشا اللہ۔ کیا خوبصورت نام ہے 'بزم اراعیاں' یہ پھبتی اتنی مقبول ہوئی کہ اب دوستوں کے حلقے میں اسے اصلی نام کی بجائے "بزم اراعیاں" کے نام سے ہی یاد کیا جاتا ہے مگر صرف دوستوں کے حلقے میں نامحرم خواتین و حضرات سے التجا ہے کہ براہِ کرم اسے غالب والے صحیح نام ہی سے پکاریں۔ دوسرے ارائیں بھائیوں سے التماس ہے کہ لطیفے کو لطیفہ سمجھیں۔ کہیں مصنّف کو بزم اراعیاں کی رکنیت کیلئے چندہ بھیجنا نہ شروع کر دیں۔ بہرحال مصنّف ایک غیر اراعی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔

وغیرہ۔

## عشقسانے

یہ لفظ عشقیہ افسانے کی مختصر یا منجمد سی شکل ہے ۔ اس سے پہلے لوگ نفسانے اور نغمانے کی اصطلاحیں ایجاد کر چکے ہیں۔ اگر ایسی ایجادات میں کوئی خوبی ہے تو اس کی شاباش میرے پیشروؤں کو جانا چاہیے۔ میں نے صرف نقل ماری ہے۔ ویسے عشقسانے کی سُرخی سے یہ نہ سمجھیں کہ یہ سب کہانیاں محض افسانے ہیں۔ تقریباً ہر کہانی کی بنیاد ایک سچّا واقعہ ہے۔ افسانے کا عنصر صرف بیان میں در آتا ہے اور یہ داستان گوؤں کا پرانا دستور ہے کہ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کیلیئے۔ میرے نزدیک اس بڑھانے یا گھٹانے ہی سے کہانی ادب بنتی ہے۔ پتھر کو چھیلنے ہی سے مجسّمہ وجود میں آتا ہے۔

## انشایئے

یہ محض اس لئے انشایئے ہیں کہ آج کل ایسے مضامین کو انشایئے کہنا فیشن ہو گیا ہے۔

اگر انہیں صرف مضامین کہا جائے تو اسے ذرا کم ذات کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ کسی ادب پارے کی قدر و قیمت اس کے لیبل (نام) سے گھٹ بڑھ نہیں سکتی۔ بہر حال اگر کوئی صاحب انہیں انشائیے نہیں سمجھتے تو اسے کاٹ کر وہ لکھ لیں جو کچھ کہ انہیں سمجھتے ہیں۔

تم کوئی اچھا سا رکھ لو میرے ویرانے کا نام

## مصنّف بیتی

اس کی مفصّل تشریح تو مضمون میں کر دی ہے۔ مختصراً یہ وہ واقعات ہیں جو مصنّف کو مصنّف ہونے کی وجہ سے پیش آئے۔ لیکن اگر وہ سیدھی سادی بے لکھی پڑھی فوجی زندگی گزارتا رہتا تو اسے کوئی کچھ نہ کہتا لیکن وہ کچھ لکھ بیٹھا اور پھر اسے کچھ کہا جانے لگا اور اس طرح اسے لاکھوں کے بول۔۔۔ کچھ کھٹے کچھ میٹھے۔۔۔ سننے اور سہنے پڑے۔ مصنّف بیتی میں ان ہی بولوں کی باتیں ہیں۔

اس کتاب کی بیشتر تحریریں تفریحی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان سے نہ ہی افراد کی عاقبت سنورنے کا امکان ہے اور نہ امتّوں کی تقدیریں بدلنے کا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ان تحریروں سے آپ کے چہرے پر نہ سہی آپ کے ذہن میں ایک روشنی کی کرن پھوٹ

پڑے۔ ایک فرحت کی کرن! اور یہ ہو جائے تو ہمیں اپنی پیٹھ تھپکانے کا حق ہو گا اور اگر یہ کرن نہ پھوٹے تو پھر آپ اپنی پیٹھ تھپکا لیں۔

ایک خاتون تشریف لائیں۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد انھیں تو تقریباً نالاں سی تھیں۔ وجہ ملال پوچھی تو فرمایا: "کرنل صاحب۔ ہم تو سمجھتے تھے آپ ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتے ہیں لیکن آپ تو بالکل دوسرے لوگوں کی طرح سیدھی سادی باتیں کرتے ہیں۔ بس کسی وقت ہی ہنستے یا ہنساتے ہیں۔" اور پھر ایک واضح سی سسکی لی!

قارئین ہنسنا ہنسانا تو مخاطب کی کیمسٹری یا ظرف پر منحصر ہے لیکن ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونا یا کرنا مزاح نگار کا نہیں، جوکر کا کام ہے۔ میں ایسے باکمال جوکروں کا مدّاح ضرور ہوں مگر بدقسمتی سے ان میں سے ایک نہیں ہوں۔ بلکہ میں تو اتنا پکا مزاح نگار بھی نہیں ہوں۔ کچا سا ہوں اور اس کتاب میں تو چند ایسے مضامین بھی ہیں جن کا مقصد ہنسانا ہے ہی نہیں۔ اگرچہ اس بات کا بھی اہتمام نہیں کیا گیا کہ انہیں پڑھ کر آپ لازماً رو ہی دیں۔ دراصل رونے اور ہنسنے کے درمیان بھی ایک بڑی اطمینان بخش سی کیفیت ہے: شگفتہ خاطری! کسی تحریر میں ہنسے یا روئے بغیر جذب ہو جانے کی کیفیت: وہی ذہن میں ایک فرحت کی کرن پھوٹنے کا عمل!

سو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس مجموعے میں کچھ سنجیدہ مضامین بھی ہیں اور وہ جنہیں

مزاحیہ کہا جا سکتا ہے، ان کا مزاح بھی ہلکے گلابی رنگ کا ہے۔ دراصل مجھے مزاح نگاری کا دعویٰ ہے نہ سلیقہ اور طنز کا تو شاید مجھے شعور ہی نہیں۔ میری کوشش فقط یہ ہوتی ہے کہ تحریر میں یبوست [۲] نہ آنے پائے۔ ہو سکے تو کچھ بشاشت ہو، شگفتگی ہو، کچھ رونق ہو، کچھ ہلا گلا ہو۔ طبعاً میرا جی غم، غلاظت، غبار اور رونے دھونے سے بیزار ہے۔ ایسے مضامین ذہن میں آتے ہیں نہ نوکِ قلم پر۔ یہ نہیں کہ زندگی میں غم، غلاظت، غبار اور رونا دھونا نہیں۔ یہ ساری مصیبتیں ہیں اور بے حد و حساب ہیں لیکن چونکہ ہیں لہٰذا لازم نہیں کہ انہیں بِلا ضرورت تحریر میں بھی گھسیٹا جائے اور جہاں ان آلام کا گزر نہیں وہاں بھی پہنچائے جائیں۔ دیکھیں نا، جب میں آپ کو اپنی کتاب پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں تو گویا آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتا ہوں اور ظاہر ہے کہ میں خواہ کتنا ہی نادار، غمزدہ اور پریشان حال کیوں نہ ہوں آپ کے مقدم میں حتیٰ المقدور گھر کو پھولوں سے اور چہرے کو تبسّم سے آراستہ کرنے کی کوشش کروں گا اور پینے کیلئے آپ کو چائے یا شربت پیش کروں گا، نہ کہ کالی مرچوں کا جوشاندہ۔ پھر بات کرنے کیلئے کسی رخِ زیبا، کسی صبحِ خنداں، کسی فکر فروزاں کا مضمون چھیڑوں گا نہ کہ اپنی بد حالی، یا آپ کی بد ہضمی یا ہمسائے کی بے خوابی کا قصّہ لے بیٹھوں گا۔ سو ہماری تو احباب سے یہی التجا ہے

---

[۲] بے لطف ہونے کی حالت یا کیفیت، دلچسپی سے خالی ہونے کی حالت، بے مزگی، بے ذوقی۔

کہ بد ہضمی پر کان نہ دھرو بلکہ

کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو (فیض)

بجنگ آمد اور بسلامت روی کے برعکس یہ کتاب 'جیسا کہ اشارہ کر چکا ہوں' متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اب متفرق مضامین کا خاصہ ہے کہ ان کے مزاج بھی لازماً متفرق ہی ہوتے ہیں۔ ان میں تسلسل کا مزا تو نہیں ہوتا مگر تنوّع کی چاشنی ہوتی ہے۔ مسلسل کتاب اگر دلچسپ نہ ہو تو دردِ سر بن جاتی ہے۔ چاول کا ایک دانہ چکھنے پر سخت نکلے تو ساری دیگ پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن مجموعے کا ایک مضمون ذرا پھیکا ہو تو قابلِ برداشت ہوتا ہے کہ ایک نہ سہی، دوسرا سہی۔ چنانچہ امید ہے آپ اس کتاب کو اتنے بڑے خسارے کا سودا نہ پائیں گے۔

کچھ فرق انار کی لطافت میں نہیں

ہوں اس میں اگر گلے سڑے دانے چند

## انتساب بیتی

صفحہ ۵ پر آپ نے انتساب کی چند سطریں پڑھی ہوئی۔ اس انتساب کے پیچھے ایک

چھوٹی سی کہانی ہے۔ جیسا کہ بعض اوقات انگریزی داں اُردُو نویسوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ خیال ذہن میں انگریزی جامے میں نمودار ہوتا ہے مگر اسے پیش کرنے سے پہلے اُردُو کا لباس پہنا دیتے ہیں، کچھ یہی حادثہ میرے ساتھ ہوا۔ انتساب لکھنے بیٹھا تو سوچ کے پہلے ہی لمحے میں ذہن میں ایک انگریزی جملہ ابھرا:

To Friends

Whose love and affection

Made life worth while

پھر پہلی دو سطروں کو تو دو لمحوں میں اُردُو میں ملبوس کر دیا "یعنی ان دوستوں کے نام جن کے خلوص اور محبّت نے"

مگر تیسری سطر کیلئے کئی روز تک دیدہ زیب اُردُو جامہ نہ مِل سکا۔ ناچار انہی دوستوں سے جن کی محبّت اور خلوص نے یہ مخمصہ کھڑا کیا تھا؟ رجوع کیا۔ پنڈی والے یار تو موجود ہی تھے۔ کچھ لاہور والے بھی آ گئے اور Made life worth while کے ترجمے پر طبع آزمایاں ہونے لگیں۔ ذرا آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ان دوستوں کے نام جن کے خلوص اور محبّت نے

۱۔ زندگی کو قابلِ رشک بنادیا۔

۲۔ زندگی کو باعثِ لطف بنادیا۔

۳۔ زندگی کو تابندہ تر کر دیا۔

۴۔ زندگی کو زندگی بنادیا۔

۵۔ زندگی کو شایانِ زیست بنادیا۔

۶۔ زندگی کو جینے کے قابل بنایا۔

۷۔ زندہ رہنے کا جواز بخشا۔

۸۔ زندگی میں نکھار پیدا کر دیا۔

۹۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنادیا۔

۱۰۔ اندازِ زندگی کو شایانِ زندگی کر دیا۔

کچھ اور ترجمے بھی گھڑے گئے مگر کسی ایک پر بھی اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ ناکامی کا اقرار کر لیا جائے اور انتساب انگریزی ہی میں لکھ دیا جائے۔ اس پر جمیل

یوسف بولے کہ پھر اُردُو کا بھرم رکھنے کیلئے انگریزی جملے کے نیچے قیوم نظر کا یہ شعر بھی لکھ دیں جو انگریزی جملے کا مفہوم ذرا مختلف مگر خوبصورت انداز میں ادا کرتا ہے:

تیری نظر سے تجھ کو خبر ہے کہ کیا ہوا؟

دِل زندگی سے بارِ دگر آشنا ہوا!

ہر چند کہ انگریزی جملہ ہی میرے مافی الضمیر کا ترجمان تھا۔ تاہم مجھے انگریزی میں انتساب لکھنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ کچھ ذہنی ردّو کد کے بعد وہ کچھ لکھا جو آپ نے اس صفحے پر پڑھ چکے ہیں۔ اس سے بھی میں سو فیصد مطمئن تو نہیں لیکن یہ تمام تراجم میں مجھے سب سے کم غیر تسلّی بخش لگتا ہے۔

چنانچہ قارئین محترم، ترجمے کیلئے اب بھی یارانِ نکتہ داں کیلئے صلائے عام ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی تیر بہدف سا ترجمہ آجائے تو عنایت فرمایئے گا۔ اگر دِل کو لگا تو وعدہ کرتے ہیں کہ

۱۔ اگلے ایڈیشن میں آپ کے ترجمے کو موجودہ انتساب کی جگہ زینتِ کتاب کریں گے۔

۲۔ آپ کے حسنِ ذوق کا اس دیباچے میں تحریری اقرار کریں گے۔

۳۔ اور آخر میں آپ کو اعتراض نہ ہو اتو لوحِ دِل پر بھی آپ کا نام رقم کر لیں گے۔

## تکیۂ تحریر

ہر لکھنے والے کو کوئی خاص لفظ یا محاورہ یا پیرایہ اظہار مرغوب ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ اس کی کمزوری ہوتا ہے اور لاشعوری طور پر اس کی نوکِ قلم پر اسی بے تکلّفی سے آجاتا ہے جیسے تکیۂ کلام نوکِ زبان پر۔ کسی ایک مضمون میں تو وہ اپنا تکیہ کلام بلکہ تکیہ تحریر دُہرانے سے پرہیز کر سکتا ہے مگر جہاں بہت سے متفرق مضامین کا معاملہ ہو جو مختلف اوقات پر لکھے گئے ہوں۔۔۔ جیسے کہ اس کتاب کے مضامین ہیں۔۔۔ تو اس کمزوری کی تکرار ناگزیر ہے۔ اگر کتاب پڑھتے وقت اسی تکرار کا احساس ہو تو ازراہِ کرم اسے نظر انداز فرمائیں۔ یہ انسانی کمزوری ہے اور بحمدللہ ہم سب انسان ہیں۔

## ایک گذارش

میرا نام محمد خان ہے لیکن ادبی حلقوں خصوصاً ناشروں نے میرے عہدے کو بھی میرے نام کا حصّہ بنا دیا ہے۔ لیکن جیسے بعض سکھوں کا نام کرنیل سنگھ ہوتا ہے۔

بے شک میری کرنیلی سردار جی کی کرنیلی سے زیادہ اصلی یا جینوئن (GENUINE) ہے اور مجھے اس کی علیٰحدہ خوشی اور فخر ہے تاہم حصّہ نام کے طور پر میں اس سے علیحدگی چاہتا ہوں اور اس کیلئے آپ کے تعاون کا خواستگار ہوں۔ آخر کتنے دوسرے محمد خان کتابیں لکھ چُکے ہیں کہ ان کے ساتھ کنفیوژن (CONFUSION) کا خطرہ ہو۔ بلکہ پاکستان میں تادمِ تحریر (۱۹۸۰ء) جہاں مصنّف محمد خان ایک ہی ہے وہاں کرنل محمد خاں کم و بیش ایک درجن ہیں اور یہ تعداد بھی گھٹنے کی نہیں کہ پیچھے سے سینکڑوں لفٹین اور کپتان محمد خانوں کی کمک اوپر آرہی ہے۔ آج تک اگر کسی محمد خاں سے کنفیوژن واقع ہوا ہے تو اس کی کرنیلی کی وجہ سے ہوا ہے نہ کہ محض اسکی محمد خانی کے باعث۔

علوی صاحب لکھتے ہیں ”میں مری کے پنڈی پوائنٹ پر سیر کر رہا تھا کہ اچانک آپ کے بنگلے کے سامنے سے گزر ہوا۔ گیٹ کی تختی پر جلّی قلم سے کرنل محمد خاں لکھا ہوا تھا۔ سوچا کیوں نہ دو گھڑی گپ لگائیں اور مل کر چائے پئیں۔ اندر گیا۔ نوکر سامنے آیا۔ پوچھا کرنل صاحب گھر پر ہیں؟ بولا جی ہاں۔ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔ میں انہیں خبر کرتا ہوں پھر کرنل صاحب آئے بڑے پیارے آدمی تھے مگر وہ آپ نہ تھے۔ یہ صاحب مغالطے پر ذرا برہم نہ ہوئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ تواضع کی اور جب اٹھنے لگا تو بولے:

اس گرما میں آپ کرنل محمد خان (مصنّف) کے چوتھے مہمان ہیں جو میری چائے پی کر جارہے ہیں۔ اس شخص کو جا کر مشورہ دیں کہ یا تو اپنا نام بدل دے ورنہ چائے کے بل ادا کرے“

سو عرض ہے کہ بطور مصنّف میں نے اپنا نام کرنل محمد خاں سے بدل کر محمد خاں رکھ لیا ہے اور آئندہ مجھے اسی نام سے پکارا جائے۔

محمد خان

راولپنڈی کلب راولپنڈی

۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

# مقدمہ ثانی

بزم آرائیاں کے پیش لفظ میں۔۔۔ جو اس کے پہلے ایڈیشن میں دو سال قبل تحریر ہوا تھا۔۔۔ میں نے مندرجہ ذیل دو عنوانات کے تحت کچھ لکھا تھا:

۱۔ انتساب بیتی

۲۔ ایک گزارش

## انتساب بیتی

میں نے انگریزی جملے (Made Life Worth While) کے چند تراجم درج کیے تھے اور قارئین سے التجا کی تھی کہ کوئی بہتر ترجمہ عنایت کر سکیں تو اسے بصد شکر، موجودہ انتساب کی جگہ دی جائے گی۔ اس دعوت کے جواب میں احباب نے دِل کھول

کر کرم فرمائی کی۔ ہر ترجمہ دامنِ دِل کھینچتا تھا مگر وہ جو یکسر دامن گیر ہو گیا، جناب محمد انور (پبلک سکول ایبٹ آباد) کا عطیہ تھا اور وہ یہ تھا:

"زیست کا مزا پایا"

اس ترجمے میں اس کی موزونیت کے علاوہ ایک اور خوبی بھی آپ کو نظر آئے گی۔ یہ غالب کی تخلیق ہے! بہر حال یہ دریافت جناب محمد انور ہی کی ہے۔ سو انور صاحب قبلہ، حسب وعدہ:

ا۔ پرانے ترجمے کی جگہ آپ کی دریافت زیبِ انتساب ہے۔

۲۔ آپ کے حسنِ ذوق کا تحریراً اقرار کرتے ہیں۔

۳۔ آپ کا نام لوحِ دِل پر لکھ لیا ہے۔ جب چاہیں جھانک کر تصدیق کر لیں۔

# ایک گزارش

گزارش یہ کی تھی کہ چند وجوہات کے پیش نظر مجھے کرنل محمد خاں کی بجائے صرف محمد خاں کہا جائے، مگر افسوس یہ تجربہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ بہت سے کرم فرماؤں نے تو اس التجا کو یہ کہہ کر یک قلم رد کر دیا کہ ایک مدّت سے کرنل تمہارے نام کا حصّہ بن

چکا ہے۔ اب اسے جھاڑ کر سامنے آنا محض سوانگ ہے۔ تم چاہو نہ چاہو، تمہیں کرنل ہی کہیں گے۔۔۔ اور کہہ رہے ہیں۔ بعض دوستوں نے فرمایا کہ دیکھو میاں محمد خاں اتنا چھوٹا، ہلکا اور پتلا سا نام ہے کہ اس کا وزن بڑھانے کے لئے اس کے ساتھ اگر عہدہ نہیں تو کوئی لقب، کوئی خطاب، ضرور چھپانا چاہئے۔ چنانچہ مختلف خیر خواہ اور غمگسار مختلف القاب پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ کوئی منشی محمد خاں لکھتا تو کوئی بخشی محمد خاں اور کوئی مفتی محمد خاں۔ چند بے تکلّف دوستوں نے توڈاکو محمد خان سے خطاب کر کے وزن میں اتنا اضافہ کر دیا کہ اٹھائے نہ اُٹھے۔۔۔ اس دو سالہ طوائف الملوکی کو ختم کرنے کے لئے میں نے اب ناچار اپنا عہدہ بحال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ براہِ کرم آئندہ مجھے کسی لقب سے نوازنا چاہیں تو صرف کرنل ہی کافی سمجھیں۔ یہ نہیں کہ میرے نزدیک دوسرے القاب میں کوئی فنی خرابی ہے۔ فقط یہ کہ میں سیدھا سادہ فوجی ہوں اور ایک فوجی پر منشی، بخشی، مفتی حتیٰ کہ ڈاکو جیسے بھاری بھر کم القاب ضائع کرنا مناسب نہیں۔ آپ تو خود دانا و بینا ہیں۔

کتاب میں نے اُردُو کے صفِ اوّل کے دس مزاح نگاروں کو ریاستیں الاٹ کی تھیں اور ساتھ ہی وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی اعلیٰ پائے کے مزاح نگار کا نام رہ گیا ہو تو اگلے ایڈیشن میں تلافی کر دی جائے گی۔۔۔ ایک نام جو یقیناً ایک علیحدہ ریاست کا مستحق تھا، سچ مچ رہ

گیا اور وہ نام ہے جناب مظفرؒ بخاری کا۔ قارئین سے التجا ہے کہ براہِ کرم اپنے اپنے نقشوں میں ترمیم کر کے یہ نام بھی درج کر لیں۔

محمد خاں

راولپنڈی کلب راولپنڈی

یکم ستمبر ۱۹۸۴ء

# یہ نہ تھی ہماری قسمت۔۔۔۔

## یہ کالج کے دنوں کا واقعہ ہے

ایک دن یکایک ہماری کلاس یعنی ایم اے فائنل کے لڑکوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ہمارے ایک مخنتی سے ہم جماعت مولوی عبدالرحمان کو ایف اے کی طالبہ کی ٹیوشن مل گئی ہے۔ چرچا ٹیوشن کی وجہ سے نہ تھا بلکہ لڑکی کی وجہ سے کیونکہ افواہ کی رو سے لڑکی حسین ہی نہ تھی، فطین بھی تھی۔ پانچ سال اپنے بیرسٹر باپ کے ساتھ ولایت رہ کر آئی تھی۔ فیشن کی کوئی ایسی ادانہ تھی جو اسے یاد نہ ہو۔ انگریزی فر فر بولتی تھی اور کلاس میں اپنی پروفیسروں کے کان بھی کترتی تھی۔ صرف اُردُو میں کمزور تھی۔ یہ کمزوری بھی اس نے حسن اور انگریزی کے زور سے کسی قدر پوری کر لی تھی اور باقی کی پورا کرنے کیلئے ٹیوشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

لڑکی کے کوائف سن کر مولوی عبدالرحمان کے ہم جماعت رشک اور حسد سے حسبِ توفیق لال پیلے اور نیلے ہونے لگے۔ کئی ایک نے مولوی صاحب کی ڈاڑھی کے متعلق نارواسی باتیں بھی کیں اور درمیان میں ان جانوروں کا ذکر لے آئے جن کی ٹھوڑی کے نیچے بال ہوتے ہیں، لیکن اس تمام غیبت سے مولوی عبدالرحمان کی ڈاڑھی کا ایک بال تک بیکانہ ہو کیونکہ ہر روز کی دست برد سے آپ کے جو بال بیکا ہونے تھے، ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے۔ بظاہر پکّے تھے۔ چنانچہ اکثر حاسدوں نے مولوی عبدالرحمان پر ڈاڑھی سمیت ہی رالیں بہائیں۔ ہم نے رال پر تو قابو رکھا لیکن اندر خانے ہم بھی ذرا حاسد ہی تھے۔۔۔ ہمیں قسمت سے اصل شکایت تو یہ تھی کہ اس ٹیوشن کیلئے ہم کیوں نہ چُنے گئے۔ یعنی ہم کہ سرخ و سپید بانکے، بے فکرے چھ فٹ قد کے جوانِ رعنا تھے اور بیرسٹر صاحب کے گھر یوں لگتے جیسے رابرٹ ٹیلر کو ٹیوٹر رکھ لیا ہو، لیکن قرعہ پڑا تو مولوی صاحب کے نام جو اپنی موٹی چادر کی عینک میں ہوں نظر آتے تھے جیسے شیشوں کے پیچھے سے اُود بلاؤ جھانک رہا ہو۔ ہمیں لڑکی کے ٹیوٹر چینوں کی بد مذاقی پر بہت غصّہ آیا۔ مولوی عبدالرحمان کو کسی لڑکے یا بھینگی سی لڑکی کا ٹیوٹر چُن لیا جاتا تو ہمیں شکایت نہ ہوتی، لیکن ایک آہو چشم قتّالہ کیلئے ان کا انتخاب قسمت کی سخت غلط بخشی تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ قسمت قد ناپ کر نعمتیں تقسیم نہیں کرتی۔ ہاں کبھی کبھی بی اے کے نمبر دیکھ لیتی ہے اور اس میں مولوی صاحب ہمیں کوئی دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ بہر حال نمبر کم سہی، ہمارے دِل کے ارمان اتنے کم نہ تھے۔ اگر ہمارے نمبروں کے

ساتھ ہماری حسرتوں کا شمار بھی کیا جاتا تو ایگریگیٹ میں ہم بڑی اونچی پوزیشن حاصل کرتے اور یہ ٹیوشن بھی، کیونکہ ہمارا ایک ارمان ایک ایسی ہی پیاری سی ٹیوشن کا تھا۔ لیکن دِل کے ارمانوں کا قدردان قیس کو نہ ملا، فرہاد کو نہ ملا، رانجھے کو نہ ملا۔۔۔ اور شاید اسی لئے کہ ان لوگوں نے میٹرک بھی پاس نہ کیا۔ ہمیں کیا ملتا؟ بلکہ ہم رشک اور حسد کو بھی ہضم کر گئے اور ایک دن سامنے سے آتے ہوئے مولوی عبدالرحمان ملے تو انہیں مبارکباد پیش کر دی۔

مولوی صاحب نے حسد کے طوفان میں مبارکباد کی آواز سنی تو ہمیں سینے سے لگالیا۔ بولے:

"ساری کلاس میں ایک تم شریف لڑکے ہو۔"

میں نے جلد ہی سینے بلکہ ڈاڑھی سے الگ ہو کر کہا:

"اور آپ شریف ہی نہیں، قابل بھی ہیں۔ یہ ٹیوشن آپ ہی کو ملنا چاہیئے تھی۔"

مولوی عبدالرحمان نے اپنی زندگی میں تحسین کے پھول یوں برستے نہ دیکھے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر مجھے سینے سے لگانے کی ناکام کوشش کی۔ اور میں لڑکی کے متعلق کچھ جاننے کو بے تاب تھا۔ سہمے سہمے پوچھا:

"مولوی صاحب لڑکی کیسی ہے؟"

”بڑے دولتمند باپ کی بیٹی ہے۔ انکا ایک بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں۔ تین نوکر ہیں۔۔۔
۔“

مجھے باپ کے اعداد و شمار میں دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا بات کاٹتے ہوئے بولا:

”مولانا باپ نہیں لڑکی کیسی ہے؟“

اور لفظ لڑکی پر زور دے کر اسے خوب انڈر لائن کیا۔ مولانا کس قدر حیرانی سے بولے:

”تمہارا مطلب کیا ہے۔“

”مطلب یہ کہ کیا لڑکی خوبصورت ہے؟“

یوں دن دہاڑے لڑکی کی خوبصورتی کے متعلق سوال سن کر مولانا کے کان سرخ ہونے لگے، بولے:

”بھئی مجھے تو معلوم نہیں۔ میں نے تو اسے کبھی آنکھ بھر کر دیکھا نہیں۔“

”آنکھ بھر کر دیکھا نہیں؟ پڑھاتے وقت آپ اپنی شاگرد کے روبرو بیٹھتے ہیں یا پُشت بہ پُشت؟“

”بیٹھتا تو سامنے ہوں مگر میں نے کبھی آنکھ نہیں اُٹھائی۔“

"کیوں نہیں اُٹھائی۔"

"بری بات ہے۔"

"لیکن آنکھ جھکا کر اس کے پاؤں تو دیکھتے رہتے ہوئے۔ یہ کیسی بات ہے؟"

"پاؤں میں تو چپل پہنتی ہے۔"

یہ کہہ کر مولوی صاحب ہماری سادگی پر مُسکرا دیئے۔ گویا کہتے ہوں کیا مسکت جواب دیاہے اس پر ہم نے مزید خراج ادا کرتے ہوئے کہا:

"مولوی صاحب آپ بے شک نیک آدمی ہیں۔"

"آپ بھی تو ہیں۔"

یہ چار لفظوں کا جملہ مولوی صاحب نے اسی انداز میں ادا کیا جیسے حبیب بینک کے ٹی وی کے اشتہار میں ایک بچّہ کہتا ہے "میلا بھی تو ہے۔" پھر رخصت ہونے سے پہلے آپ نے بالکل بچگانہ طور پر تیسری ناکام کوشش کی۔ جی ہاں، ہمیں سینے اور ڈاڑھی سے لگانے کی۔

لیکن اب مولوی صاحب کی اور ہماری دوستی پکّی ہو چکی تھی۔ ہر صبح مولوی صاحب سے گزشتہ شام کے سبق کی نہایت متشرع روداد سنتے۔ لڑکی بے چاری کی قسمت پر آنسو

بہاتے لیکن جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو داد دیتے اور وہ ہمیں دعا دیتے رخصت ہو جاتے۔

ایک روز مولوی صاحب ذرا خلافِ معمول پریشاں حال نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے: ”گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ ماں بیمار ہے۔ ماں کی عیادت بھی لازم ہے اور ٹیوشن میں ناغہ ہوا تو بیرسٹر صاحب کے ناراض ہونے کا بھی خوف ہے۔“

میں نے کہا:

”ناراض کیوں ہونگے؟ آخر مجبوری ہے۔ آپ بیرسٹر صاحب سے بات تو کر لیں۔“

”کر لی ہے۔ کہتے ہیں سالانہ امتحان میں صرف دس دن باقی ہیں اور رضیہ اُردُو میں بدستور کمزور ہے۔“

”تو کیا ان کا خیال ہے کہ اگر رضیہ کی اُردُو کی کمزوری رفع نہ ہوئی تو دشمن ملک پر حملہ کر دے گا؟“

مولوی صاحب میرا سوال ٹال گئے۔ شاید سمجھ ہی نہ سکے اور بولے:

”بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر جانا لازم ہے تو اپنی جگہ کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤ۔ اب میں موزوں آدمی کہاں سے لاؤں؟“

معاً ہمیں خیال آیا کہ ہم آدمی تو یقیناً ہیں۔ باقی رہی موزونیت تو چند اور خوبیوں کے علاوہ ہم اُردُو بھی لکھ پڑھ بلکہ پڑھا سکتے ہیں۔۔۔ مگر یہ ہمارا خیال تھا۔۔۔ سوال یہ تھا کہ کیا یہ خوبصورت خیال مولوی صاحب اور بیرسٹر صاحب کو بھی آ سکتا تھا؟ بلا دعوت اپنی خدمات پیش کرتا تو شان کے خلاف تھا۔ چنانچہ امید کے دامن کا ایک تار تھام کر ہم نے کہا:

”بے شک موزوں آدمی ملنا مشکل ہے اگرچہ، البتہ یہ بات ہے کہ ناممکن نہیں۔“

مولانا بولے: ”بس ایک ہی صورت ہے۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ اگر آپ زحمت نہ سمجھیں تو دو روز میری جگہ پڑھا آئیں۔“

یہ تو وہی بات ہوئی کہ دعا منہ سے نکلی نہیں اور اجابت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

لیکن ہماری مسرّت سے کہیں زیادہ ہماری حیرت تھی۔ ہمارے منہ سے کسی قدر اضطرار میں نکلا:

”میں یعنی میں خود پڑھا آؤں؟“

”جی ہاں۔ آپ خود۔“

”مولانا۔ آپ کی ذرّہ نوازی ہے اور مجھے انکار بھی نہیں لیکن یہ بتائیں کہ کیا بیرسٹر صاحب بھی اتنے ہی ذرّہ نواز ہیں؟“

”میں نے بیرسٹر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج شام میرے ساتھ چلئے گا۔“

یہ وہی پرانی کہانیوں والا قصّہ تھا: شہزادی سامنے قلعے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کیلئے شہزادے کو فقط ایک اژدہا اور دو شیر ہلاک کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ شاید دونوں مہموں کی نسبت ایک بیرسٹر راضی کرنا زیادہ دشوار تھا۔ پھر مولوی عبدالرحمان رخصت ہونے لگے تو جیسے کچھ اچانک یاد آ گیا ہو، بولے:

”ہاں ایک بات اگر آپ بُرا نہ مانیں۔“

”ارشاد۔“

”کیا ہی اچھا ہو اگر آپ سوٹ کی جگہ اچکن پہن کر آئیں۔“

”لیکن میرے پاس اچکن تو ہے نہیں۔“

”کہیں سے مانگ نہیں سکتے؟“

”مولانا، مانگ تو سکتا ہوں، پھر آپ کہیں گے ایک ڈاڑھی بھی مانگ لاؤ۔“

"ڈاڑھی نہیں، ٹوپی"۔

"قبلہ میں بیرسٹر صاحب کے گھر لڑکی پڑھانے جاؤں گا یا جمعہ پڑھنے؟"

"بات یہ ہے کہ ننگا سر ٹھیک نہیں ہوتا اور اچکن اور ٹوپی میں آدمی شریف لگتا ہے۔"

اب مولوی عبدالرحمان سے کیا بحث کرتے۔ ہم نے بڑے بڑے سمگلروں کو اچکن اور ٹوپی پہنے دیکھا تھا۔ بہر حال انہیں یقین دلایا کہ انکی خاطر۔۔۔ جو دراصل اپنی ہی خاطر تھی۔۔۔ اچکن اور ٹوپی کا انتظام بھی کریں گے اور آخر شام سے پہلے ڈھیلی سے بدرنگ سی اچکن اور پیلی سی تنگ سی ٹوپی پیدا کرلی:

شام بیرسٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دولت کدے سے سو گز ادھر ہی جھک گئیں اور ایسی کہ پھر اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ مولوی صاحب نے ہمیں بھی تلقین کی کہ نظریں اٹھانے سے پرہیز کرنا لیکن ہم سے کوشش کے باوجود بدپرہیزی ہوتی رہی۔ بیرسٹر صاحب کے روبرو ہوئے تو مولوی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ جواب میں بیرسٹر صاحب نے بظاہر تو مزاج پرسی کی، لیکن حقیقت میں ہمارا معائنہ کرنے لگے جو طبّی معائنے سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ لیکن ہمیں تو بہت الٹ پلٹ کر نہ دیکھا لیکن خود بہت الٹے پلٹے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر زاویے سے فرضی

ٹوٹی لگا کر ہماری نیّت کی رفتار ناپ رہے ہوں۔ آخر غالباً ہماری اچکن اور ٹوپی سے متاثر ہو کر فرمایا:

"لڑکا شریف ہی لگتا ہے۔"

پھر مولوی صاحب کو رخصت دے دی اور ہمیں رضیہ تک پہنچا آئے۔

رضیہ ہماری توقع سے بھی زیادہ حسین تھی اور حسین ہی نہیں، کیا فتنہ گر قدر گیسو تھی!

پہلی نگاہ پر ہی محسوس ہوا کہ INITIATIVE ہمارے ہاتھ سے نکل کر فریق مخالف کے پاس چلا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال بھی ادھر ہی سے آیا:

"تو آپ ہیں ہمارے نئے نویلے ٹیوٹر؟"

اب اس شوخ سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ تو آپ ہیں ہماری نئی نویلی شاگرد؟

لیکن سچی بات ہے کہ حسن کی سرکار میں ہماری شوخی ایک لمحے کیلئے ماند پڑ گئی اور ہمارے منہ سے ایک بے جان سا جواب نکلا:

"جی ہاں، نیا تو ہوں، ٹیوٹر نہیں ہوں۔ مولوی صاحب کی جگہ آیا ہوں۔"

"اس سے آپ کی ٹیوٹری میں کیا فرق پڑتا ہے؟"

”یہی کہ عارضی ہوں۔“

”تو عارضی ٹیوٹر صاحب۔ ہمیں ذرا اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔“

رضیہ کا اشارہ دیوانِ غالب کی طرف تھا۔ میں نے کسی قدر متعجّب ہو کر پوچھا:

”آپ دیوانِ غالب کو مصیبت کہتی ہیں؟“

”جی ہاں اور خود غالب کو بھی۔“

”میں پوچھ سکتا ہوں کہ غالب پر یہ عتاب کیوں؟“

”آپ ذرا آسان اُردُو بولیے۔ عتاب کسے کہتے ہیں؟“

”عتاب غصّے کو کہتے ہیں۔“

”غصّہ؟ ہاں غصّہ اس لیے کہ غالب صاحب کا لکھا تو شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر خدا جانے، پورا دیوان کیوں لکھ مارا۔“

”اسلئے کہ لوگ پڑھ کر لذّت اور سرور حاصل کریں۔“

”نہیں جناب۔ اس لئے کہ ہر سال سینکڑوں لڑکیاں اُردُو میں فیل ہوں۔“

”محترمہ، میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے، فرمائیں آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟“

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرع پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دیکھا تو غالب کی مشہور غزل تھی:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

میں نے کہا:

"یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے۔ ذرا پڑھیئے تو۔"

"میرا خیال ہے آپ ہی پڑھیں۔ میرے پڑھنے سے اس کی لاجوابی پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ صاحبہ باتونی بھی ہیں اور ذہین بھی، لیکن اُردُو پڑھنے میں غالباً اناڑی ہی ہیں۔ میں نے کہا:

"میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہ ہو گا۔ آپ ہی پڑھیں کہ تلفّظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور سچ مچ جیسے پہلی جماعت کا بچّہ پڑھتا ہے۔

"یہ نہ تھی ہماری قِس مت کہ وِصل۔۔۔۔۔۔"

میں نے ٹوک کر کہا:

"یہ وِصل نہیں وصال ہے۔ وِصل تو سیٹی کو کہتے ہیں۔"

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم ذرا مسکرائے اور ہمارا اعتماد بحال ہونے لگا۔

رضیہ بولی۔

"اچھا وصال سہی۔ وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں؟"

"وصال کے معنی ہوتے ہیں ملاقات، محبوب سے ملاقات۔ آپ پھر مصرع پڑھیں۔"

رضیہ نے دوبارہ مصرع پڑھا۔ پہلے سے ذرا بہتر تھا لیکن وصال اور یار کو اضافت کے بغیر الگ الگ پڑھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا:

"یہ وصال یار نہیں وصالِ یار ہے۔ درمیان میں اضافت ہے۔"

"اضافت کیا ہوتی ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟"

"یہ جو چھوٹی سی زیر نظر آرہی ہے نا آپ کو، اسی کو اضافت کہتے ہیں۔"

"تو سیدھا سادا وصالے یار کیوں نہیں لکھ دیتے؟"

"اس لئے کہ وہ علماء کے نزدیک غلط ہے۔۔۔" یہ ہم نے کسی قدر رعب سے کہا:

"علماء کا وصال سے کیا تعلق ہے؟"

"علماء کا تعلق وصال سے نہیں، زیر سے ہے۔"

"اچھا جانے دیں علماء کو مطلب کیا ہوا؟"

"شاعر کہتا ہے کہ یہ میری قسمت ہی میں نہ تھا کہ یار سے وصال ہوتا۔"

"قسمت کو تو غالب صاحب درمیان میں یونہی گھسیٹ لائے ہیں۔ مطلب یہ کہ بیچارے کو وصال نصیب نہ ہوا۔"

"جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی۔"

"کیا وجہ؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں کہہ سکتے؟ آپ ٹیوٹر جو ہیں۔"

"شاعر خود خاموش ہے۔"

"تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی، مگر یہ خوش خبری سُنادی کہ وصال میں فیل ہو گئے۔"

”جی ہاں، فی الحال تو یہی ہے۔ آگے پڑھیں۔“

رضیہ نے اگلا مصرع پڑھا۔ ذرا اٹک اٹک کر مگر ٹھیک پڑھا:

”اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا۔“

میں نے رضیہ کی دلجوئی کیلیئے ذرا سرپرستانہ انداز میں کہا:

”شاباش، آپ نے بہت اچھا پڑھا ہے۔“

”اس شاباش کو تو میں ذرا بعد میں فریم کراؤں گی۔ اس وقت ذرا شعر کے پورے معنی بتا دیں۔“

ہم نے رضیہ کا طنز برداشت کرتے ہوئے کہا:

”مطلب صاف ہے۔ غالب کہتا ہے۔ قسمت میں محبوبہ سے وصال لکھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ اب موت قریب ہے مگر جیتا بھی رہتا تو وصال کے انتظار میں عمر کٹ جاتی۔“

”توبہ اللہ، اتنا LACK OF CONFIDENCE یہ غالب اتنے ہی گئے گزرے تھے؟“

”گئے گزرے؟ نہیں تو غالب ایک عظیم شاعر تھے۔“

"شاعر تو جیسے تھے، سو تھے، لیکن محبّت کے معاملے میں گھسیارے ہی نکلے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ آپ غالب کو گھسیارہ کہتی ہیں؟ وہ نجم الدولہ تھے۔"

"شاہ دولہ[1] ہوں گے۔ بے چارے عمر بھر وصال کو ترستے رہے۔"

"محترمہ شاعری میں تو فرضی باتیں ہوتی ہیں۔ غالب نے شعر لکھا ہے۔ عدالت میں حلفیہ بیان نہیں دیا۔"

"وکیلِ صفائی صاحب۔ آپ ملزم سے بھی زیادہ چست نظر آتے ہیں۔ یہ فرمائیں آپ کے نجم الدّولہ صاحب کی شادی بھی ہوئی یا نہ؟"

"یقیناً ہوئی۔"

"کسی بوڑھی کزن سے ہوئی ہو گی۔"

"نواب زادی تھی اور بوڑھی بھی نہ تھی مگر خود لونڈے ہی تھے۔ میں نہ کہتی تھی کچھ MALADJUSTMENT ضرور تھی۔"

---

[1] اس چھوٹے سر اور چھوٹے قد کی فاتر العقل مخلوق جسے ایک بزرگ کی نسبت سے شاہ دولہ یا شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں۔

”لیکن محترمہ آپ کا پرچہ غالب کی شادی پر نہیں، غالب کی شاعری پر ہو گا۔“

”شاعر کو شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔“

”لیکن اگر آپ نے امتحان سے پہلے دیوان ختم کرتا ہے تو جدا کرنا پڑے گا۔“

”مجھے امتحان کی فکر نہیں۔ پہلے غالب کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔“

”بہت اچھا تو فرمائیں۔ غالب نے کیا قصور کیا ہے؟“

”غالب نے محبّت میں مار کھا کر بے معنی شعر لکھے ہیں اور لوگوں کو اُلّو بنایا ہے۔“

”محترمہ، اُلّو بڑا غیر پارلیمانی پرندہ ہے اور غالب کے چاہنے والوں میں تو اچھّے اچھے لوگ ہیں۔ مثلاً۔۔۔“

”آپ اچھے لوگوں کی فکر نہ کریں۔ ویسے میں نے آپ کو ان پرندوں میں شامل نہیں کیا۔“

”مجھ پر یہ نظر عنایت کیوں؟ میں بھی تو غالب پرست ہوں۔“

”آپ کی جگہ اصلی ٹیوٹر نے لے رکھی ہے۔“

”تو آپ مولوی عبدالرحمن کو اُلّو سمجھتی ہیں؟“

”غالباً ان کا اپنا بھی یہی خیال ہے۔“

”محترمہ۔ ٹیوٹر اور اُلّو۔“

”جی ہاں وہ تہِ دل سے چغد ہیں۔“

”اور ہم؟“

”آپ کی بات اور ہے۔“

”ہماری کیا بات ہے؟“

”بس آپ چغد نہیں۔“

”بڑی رعایت کی آپ نے ہمیں۔“

”تو آپ شاہین بننا چاہتے ہیں کیا؟“

”ہم ہیں ہی شاہین!“

”تو پھر بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔“

”اور اگر یہاں آنا چاہیں تو؟“

”توبراہِ مہربانی یہ خوبصورت اچکن بدل کر آئیں۔“

ساتھ ہی رضیہ نے ہماری ٹوپی سے لے کر اچکن کے نچلے سِرے تک دیکھا اور بے اختیار ہنس دی۔ اتنے میں ساتھ کے کمرے سے بیرسٹر صاحب کی آواز آئی:

”بیٹا رضیہ۔ آپ کی پڑھائی کا وقت ختم ہوا۔ اب آؤ چلیں باہر۔“

رضیہ نے کتاب بند کر دی اور بولی:

”تو عارضی ٹیوٹر صاحب خدا حافظ۔“

”گویا آپ کا مطلب ہے کل نہ آوں؟“

”اتنے عارضی بھی نہ بنیں۔ کل آیئے۔ پرسوں آیئے اور آتے رہیے۔“

”پرسوں تو مولوی صاحب آجائیں گے۔“

”اللہ تعالیٰ ان کی والدہ کو دو دن ٹھہر کر شفا دے دے گا۔“

اتنے میں بیرسٹر صاحب کی آواز کی بجائے ان کا چہرہ نمودار ہوا اور میں نے آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر رخصت لی۔

ہم دوسرے روز کپڑے بدل کر پڑھانے گئے۔ سبق تو دوسرے شعر سے بہت آگے نہ بڑھا لیکن باہمی مفاہمت میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ تیسرے روز مولوی صاحب آ گئے اور ہمیں دوستوں نے آ گھیرا کہ دوروزہ ٹیوشن کی روداد سناؤ۔ ہم نے روداد سنائی تو دوست ہماری خوبیِ قسمت پر خوشی سے جھوم اٹھے۔ ہم کہانی سُنا چکے تو ہماری کلاس کے ذہین مسخرے لطیف نے باقی لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"دوستو خاموش اور ذرا توجّہ سے سُنئے۔"

ساری کلاس خاموش ہو گئی۔ لطیف نے بولنا جاری رکھا؟

"میرا استاروں کا علم کہتا ہے کہ اگلے سال ہمارے اس خوش نصیب ہم جماعت کی شادی ہو جائے گی۔ ذرا بتاؤ تو سہی اس کی دلہن کا کیا نام ہو گا؟"

ساری جماعت نے یک زبان ہو کر کہا:

"رضیہ!"

اس پر بے پناہ تالیاں بجیں۔ لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور اودھم مچایا۔

قارئین۔ کیا آپ کو بھی میرے ہم جماعتوں سے اتفاق ہے؟ سنئے اگلے سال رضیہ سچ مچ دلہن تو بنی، لیکن ہماری نہیں، مولوی عبدالرحمٰن کی! حادثہ یہ ہوا کہ ٹیوشن کے بعد

مولوی عبدالرحمن اور ہم سی ایس پی کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور مولوی صاحب ہمیں یہاں بھی دو سو نمبر پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کامیابی کے بعد اُن کے لئے رضیہ سے شادی میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور مولانا نے یہ رکاوٹ برضا و رغبت، پہلے نائی کے ہاتھوں دور کرادی۔ برضا و رغبت اس لئے کہ بقول مولوی صاحب ایک دن انہوں نے کانی آنکھ سے رضیہ کو دیکھ لیا تھا اور پھر دِل میں عہد کر لیا تھا کہ داڑھی کیا چیز ہے یہ لوح و قلم تیرے ہیں۔ ادھر بیرسٹر صاحب تو مولوی عبدالرحمن کے نام کے ساتھ سی ایس پی دیکھ کر داڑھی کی قربانی پر بھی مُصر نہ تھے۔ رہے ہم تو جونہی مولوی صاحب اپنی دلہن کو لے کر ہنی مون پر روانہ ہوئے ہم دیوانِ غالب کھول کر ایک لاجواب غزل الاپنے لگے:

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

# کار بکاؤ ہے

ہم سے پہلے بھی کوئی صاحب گزرے ہیں ہیں جنہوں نے بیٹھے بٹھائے بکری پال لی تھی اور پھر عمر بھر اس کے زانو پر سر رکھ کر منمناتے رہے تھے۔ ہمیں غیب سے یہ سوجھی کہ اتفاق سے ولایت جا رہے ہیں کیوں نہ وہاں سے نئی کار لائی جائے؟ یعنی کیوں نہ جانے سے پہلے پرانی کار بیچ دی جائے؟ اور یہ سوچنا تھا کہ جملہ اندیشۂ شہر کو لپیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا اور کار بیچنا شروع کر دی۔ بوٹی بوٹی کر کے نہیں، سالم!

ہمارے کار فروشی کے فعل کو سمجھنے کیلئے کار سے تعارف لازم ہے۔ یہ کار ان کاروں میں سے نہ تھی جو خود بِک جاتی ہیں۔ اس متاعِ ہنر کے ساتھ ہمارا اپنا بِکنا بھی لازم تھا۔ لیکن اس کار کے بِکنے کیلئے ایک پنج سالہ منصوبے کی ضرورت تھی لیکن ہمارے پاس صرف تین دن تھے کہ چوتھے روز ہم نے فرنگ کو پرواز کر جانا تھا۔ سو ہم نے ازراہِ مجبوری ایک سہ روزہ کریش پروگرام بنایا، جس کا مختصر اور مقفّٰی لب لباب یہ تھا: آج اشتہار، کل خریدار، پرسوں تیس ہزار! سو ہم نے اشتہار دے دیا۔

”ایک کار، خوش رفتار، آزمودہ کار، قبول صورت، فقط ایک مالک کی داشتہ، مالک سمندر پار جارہاہے۔ فون نمبر ۶۲۲۰۹ سے رابطہ قائم کریں۔“

یہ سب کچھ صحیح تھا لیکن جو اس سے بھی صحیح تر تھا۔۔۔ اور جسے ہم اشتہار میں بالکل گول کر گئے تھے۔۔۔ وہ موصوفہ کی عمر تھی، جس کا صحیح اندازہ حضرت خضر کے سوا کسی کو نہ تھا۔ وہ طویل مسافت تھی جو محترمہ طے کرتے کرتے لڑکھڑانے لگی تھی اور اس کے اندرونی اعضاء کی وہ باہمی شکر رنجیاں تھیں جنہیں شیر و شکر کرنے میں ممدوحہ کے مالک اور گرد و نواح کے جملہ مستری بے بس تھے۔

دوسری صبح اشتہار کے جواب میں ٹیلیفون آیا:

”السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔“

اس متشرع سلام کے جواب میں ہم نے صرف وعلیکم السلام کہا جو بہت ناکافی محسوس ہوا۔ ہمیں ذرا شک سا تھا کہ وعلیکم السلام کے ساتھ بھی برکاتہ، وغیرہ لگ سکتے ہیں یا نہیں، ورنہ جی تو چاہا کہ سلام کا دمدار ستارہ بنا کر پیش کریں۔ اتنے میں ادھر

سے آواز آئی:

”بندہ پرور، یہ کار کا اشتہار آپ نے دیا ہے؟“

"جی ہاں۔"

"کس ساخت کی ہے؟"

"فوکس ویگن ہے جناب۔ آج کل بڑی مقبول ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔ کون سا ماڈل ہے؟"

"ایسا پرانا نہیں۔ نئے ماڈل سے ملتا جلتا ہے۔"

"میرا مطلب ہے کس سال کی ساخت ہے؟"

اب ساخت تو دس سال پہلے کی تھی لیکن جواب میں یوں کھلم کھلا سچ بولنا ہمیں موافق نہ تھا۔ ادھر جھوٹ بولنا بھی ناواجب تھا۔ معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ خریدار کے شرعی رجحانات کے پیشِ نظر کار کی تاریخ پیدائش سن عیسوی کی بجائے سال ہجری میں بتائی جائے۔ شاید شعائرِ اسلام کے احترام میں مزید موشگافی نہ کرے۔ بدقسمتی سے ہمیں موجودہ سالِ ہجری کا صحیح علم نہ تھا۔ کچھ اندازہ سا تھا۔ اس سے آٹھ سال منہا کر کے کہا:

"قبلہ ۱۳۷۷ ہجری کی ساخت ہے۔"

"الحمد للہ۔ آپ تو بڑے صالح مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں تو آپ نے فرمایا ۱۳۷۷ ہجری۔ موجودہ سال جاری ہے ۱۳۹۰۔ گویا تیرہ سال پہلے کا ماڈل ہے؟"

ہم اپنے پھیلائے ہوئے دامِ تزویر میں پھنس گئے تھے۔ بہر حال ہم نے پھڑ پھڑا کر نکلنے کی کوشش کی۔ یعنی جب ہجری کو آلۂ کار نہ بنا سکے تو سیکولر پینترا بدلا اور کہا:

"جناب معاف فرمائیے گا۔ ہجری حساب کچھ ٹھیک نہیں بیٹھ رہا۔ دراصل یہ صرف دس سال پہلے کا ماڈل ہے۔"

"دس اور تیرہ میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کتنے میل کر چکی ہے؟"

ہمیں اسی سوال کا ڈر تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ دس سال میں اگر ہماری کار اِدھر اُدھر چلنے کی بجائے خطِ مستقیم میں چلتی رہتی اور تیر بھی سکتی تو بحرِ کاہل کے رستے دنیا کے چار چکر کاٹ چکی ہوتی۔ یعنی ویر چکر کی مستحق ہوتی۔ اس کا سپڈومیٹر ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل بتاتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ نکل گیا تھا وہ کوسوں دیارِ حرماں سے اور اس حقیر کرّہ ارض کا محیط زبوں تو فقط پچیس ہزار میل ہے اور اگر اُڑ بھی سکتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب نیل آرمسٹرانگ چاند پر اُترتے تو پہلی چائے غریب خانے پر نہ پیتے! الغرض ہماری کار اب دشتِ امکاں عبور کرنے کے بعد تمنّا کا دوسرا قدم تول رہی تھی، مگر افسوس کہ ہمارے گاہک کو کار کی ان ماورائی

صفّات میں دلچسپی نہ تھی، چنانچہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کتنے میل کر چکی ہے، زبان میں رعشہ پیدا ہونے لگا۔ بہر حال ہم نے اللہ کا نام لے کر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا:

"تقریباً ننانوے ہزار نو سو ننانوے میل"

ہمیں یقین تھا کہ یہ سُن کر یا تو اپنا فون توڑ دیں گے یا گریبان پھاڑ ڈالیں گے، لیکن خلافِ توقع اُدھر سے توڑ پھوڑ کی کوئی آواز نہ آئی بلکہ ایک امید افزا سوال سُنائی دیا:

"کتنی قیمت ہے؟"

"تیس ہزار۔"

یہ ہم نے آدھے سانس میں کہا اور کامیابی سے اچھو کو روکا۔ ادھر سے مولوی صاحب کی آواز آئی:

جناب بندہ۔۔۔ آپ کی کار دس سال پرانی ہے۔ ایک کم ایک لاکھ میل چل چُکی ہے۔ آپ کے کہنے کے مطابق

"حالت اچھی ہے۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے۔ تین ہزار روپے قبول فرمایئے گا؟"

"کیا فرمایا آپ نے؟"

یہ جملہ ہمارے منہ سے اضطراراً نِکلا تھا ورنہ ہم نے تین ہزار کی پیشکش اچھی طرح سُن اور سمجھ لی تھی۔ فقط ہمارے دِل میں ایک فوری قہر نے کروٹ لی تھی۔ وہی قہر جو کبھی پطرس کے دِل میں اُبھرا تھا جب خُدا بخش کے ساتھی نے اُن کی تاریخی سائیکل کی قیمت چند ٹکے تجویز کی تھی اور پطرس نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا:

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے انسان۔ مجھے اپنی توہین کی تو پروا نہیں، لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتاری سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لئے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کرونگا۔"

ہمارے غیر ارادی سوال کے جواب میں آواز آئی:

"میں نے عرض کیا تھا تین ہزار۔۔۔ لیکن آپ کو بہتر قیمت مِل سکے تو بڑے شوق سے دوسری جگہ بیچ دیں۔ ویسے زحمت نہ ہو تو میری پیش کش بھی کسی کونے میں نوٹ کر لیں۔ میرا فون نمبر یہ ہے اور میرا نام عبدالغفور ہے۔ خاکسار کو مولوی عبدالغفور کہتے ہیں۔"

تو یہ مولوی تھے۔ جبھی تو فرَ فرَ ہجری کی عیسوی بنالی تھی۔ بہر حال ہم نے اپنے سارے غصّے کا ایک فقرہ بنا کر مولوی صاحب کو پیش کیا:

"آپ سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟"

جواب میں ہلکی سی ہنسی سُنائی دی اور کچھ اس قسم کی گنگناہٹ کے جواب تلخ مے زمند لبِ لعلِ شکر خاراا اور پھر آہستگی سے فون بند ہو گیا۔ بڑا طنّاز مولوی تھا ظالم!

تھوڑی دیر میں ایک اور خریدار کا انگریزی بولتا ہوا فون آیا؟

"چھوٹا والا اشتہار موٹر کے بارے میں آپ لوگ دیا؟"

"جی ہاں میں نے ہی دیا ہے۔"

"کون والا کار ہے؟"

"فوکس ویگن والا۔"

"اس میں ریڈیو ہے؟"

"جی نہیں۔"

"یہ تو بڑا DRAW BACK ہے۔"

ہم سمجھ گئے کہ اینگلو ورنیکلر صاحب محض ٹیلیفون قریب ہونے کی وجہ سے گاہک بن بیٹھے ہیں اور مطلب کار خریدنا نہیں، خریدنے کا سواد لینا ہے۔ عرض کیا:

"جناب اس کار کا بڑا نقص یہ نہیں کہ ریڈیو نہیں رکھتی، بلکہ یہ کہ رولز رائس نہیں۔"

”فوکس ویگن میں بھی ریڈیو لگ سکتا ہے۔“

”لگنے کو تو اس میں شہد کا چھتّہ بھی لگ سکتا ہے لیکن خاکسار کی کار میں یہ ایکسٹرا فٹنگ نہیں۔ گڈ بائی۔“

ایک دو اور فون بھی آئے لیکن کار کی عمرِ رفت اور سفر گزشتہ کا ذکر آیا تو بامقصد گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ شام کی صبح ہوئی۔ ٹیلی فون ہمارے پہلو میں پڑا تھا لیکن چپ۔ سامنے آخری شب تھی، یعنی پروازِ یورپ میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ ہم نے سوچا اگر کار نہ بِکی اور اس عالمِ پیری میں اسے تین ماہ گیراج میں گزارنے پڑ گئے تو جوڑوں کے درد کا شکار ہو جائے گی اور پھر شاید کوئی مولوی غفور بھی میسّر نہ آئے۔ چلو مولوی صاحب سے ہی رجوع کریں۔ لیکن فون اُٹھایا تو ساتھ ہی مولوی صاحب کی ہنسی اور گنگناہٹ یاد آئی۔ سوچا، سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو، مگر اندر سے آواز آئی کہ میاں غالب کا پرابلم تمہارے پرابلم سے سراسر مختلف تھا۔ وہ عِشق کا معاملہ تھا۔ یہ تجارت کی بات تھی۔ بے تکلّف فون کرو۔ ہم نے بے تکلف مولوی صاحب کا نمبر ملایا اور سلام اور رحمتیں اور برکات بھیجنے کے بعد کہا:

”مولانا ساڑھے تین ہزار میں کار آپ کی ہے۔ چاہیں تو آج ہی لے جائیں۔“

تین پر ساڑھے کا اضافہ محض مولوی صاحب کی فتح کو جزوی شکست دینے کی خاطر تھا۔

لیکن قاری محترم، قصّہ کوتاہ، اسی شام مولوی صاحب ایک سو کم تین ہزار میں کار لے گئے۔ ایک سو کم اس لئے کہ بقول مولوی صاحب پہلی بات چیت کے بعد کار چند قدم چل کر اور بوڑھی ہو چکی تھی اور کچھ یہ بھی کہ مولوی صاحب کی خودی ہماری خودی سے ٹکرا کر ذرا زیادہ پائیدار نِکلی تھی۔

# شرابی کبابی

یہ قصّہ ہے ان دِنوں کا جب آتش جوان تھا اور ہم کپتان تھے اور ایک مشہور چھاؤنی کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتے تھے۔ ایک شام باہر سے لوٹے تو نوکر نے بتایا کہ ڈرائینگ روم میں دو خواتین انتظار کر رہی ہیں۔۔۔ ہمارے گھر میں خواتین! یعنی کوئی کینگرو یا لگڑ بگڑ آنکلتا تو ماننے کی بات بھی تھی۔ خواتین کا اس خالص مردانہ گھر میں کیا کام؟ بہر حال کمرے میں داخل ہوئے تو مہمانوں پر نگاہ پڑی۔۔۔ سچ مُچ خواتین تھیں!

خواتین کو خوش آمدید کہنے کی ایسی مشق تو نہ تھی لیکن ہمیں اتنی عقل ضرور تھی کہ پہلی ملاقات پر ہی وہ شعر پڑھنا قبل از وقت ہو گا کہ "وہ آئیں گھر میں ہمارے خُدا کی قدرت ہے" اگرچہ بے شک یہ بھی خُدا کی قدرت تھی۔ چنانچہ ہم نے اپنا فرض نثر ہی میں ادا کیا اور صالح مسلمانوں کی طرح صرف السلام علیکم کہا۔ جواب میں چھوٹی خاتون۔۔۔ عمر بیس اکیس سال۔۔۔ متانت اور شگفتگی سے بولیں:

”میں مسز 'خ' ہوں۔ میرے میاں ایک حادثے میں مارے گئے ہیں۔ مجھے پنشن کیلئے کسی کمشنڈ افسر سے کاغذات تصدیق کرانے ہیں۔ آپ کو زحمت دینے آئی ہوں۔ اور ہاں، یہ میری والدہ ہیں۔“

میں نے والدہ صاحبہ کی طرف سر خم کیا اور پنشن کے کاغذات پر بلا تامّل دستخط کر دیئے۔ اس پر چھوٹی محترمہ نے پہلا شکریہ ادا کیا اور سلسۂ کلام جاری رکھا:

”اگر ایک زحمت اور بھی گوارا فرما سکیں۔ مجھے ڈاک خانے سے روپے نکلواتے وقت بڑی کوفت ہوتی ہے۔ خصوصاً دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والوں سے۔ اگر آپ اپنے کسی سپاہی یا چپڑاسی کو بھیج کر روپے نکلوا لیا کریں تو میں خود آ کر آپ سے رقم لے جایا کرونگی۔ آپ کو تکلیف نہ دیتی، مگر ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں۔“

پھر پرس کھولا اور فرمایا:

”یہ ہے میری پاس بک۔“

لیکن پرس کیا کھلا گویا طبلہ عنبر کھلا۔ پاس بُک کا نکلنا تھا کہ سارا کمرہ خوشبو سے معطّر ہو گیا۔ محترمہ کے ہاتھ سے رنگ و بو میں لپٹی ہوئی کتاب لی تو ہم نے کتاب سے فارسی میں سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا:

”اے کتاب، مُشکی یا عبیری؟“

کتاب نے محترمہ سے آنکھ بچا کر ہمارے کان میں کہا:

"حضور میں تو ناچیز سی کتابچی ہوں۔ مجھ میں مُشک یا عبیر کہاں ؟ یہ تو سب جمالِ ہم نشیں کا اثر ہے۔"

میں پاس بُک سے ہمکلام تھا کہ محترمہ درمیان میں بُول پڑیں "یوں تو آپ کو تکلیف نہ دیتی لیکن چونکہ آپ یونٹ کے اکاؤنٹس افسر بھی ہیں لہٰذا آپ کیلئے بینکوں اور ڈاک خانوں سے کاروبار آسان ہے۔"

گویا تشریف آوری سے پہلے خاکسار کے پیشے اور ساکھ کے متعلق بھی تحقیق کی جا چکی تھی اور ہمیں اس امتحان میں پاس سمجھا گیا تھا۔ اسی لئے تو پہلی ملاقات پر ہی "سپردم بتومایۂ خویش را" کی نوبت آگئی تھی۔ عرض کیا:

"یہ خدمت بھی بجالاؤں گا۔"

دوسرے دن دفتر گیا۔ نائیک صوبہ خان ڈاکخانے کو جانے لگا تو اسے مسز 'خ' کے روپے نکلوانے کیلئے پاس بُک دی۔ صوبہ خان واپس آیا تو اس نے پاس بُک کو اس زور سے سونگھا کہ نصف عطر کشید کر لیا۔ پھر ہم پر ایک نہایت شُبہ آلود نگاہ ڈالی۔ پاس بُک اور نقدی میز پر رکھ کر اباؤٹ ٹرن کیا اور چل دیا۔۔۔ صوبہ خان کو اپنی بدتمیزی پر اختیار نہ تھا۔ ہمیں معاف کرنے پر اختیار تھا چنانچہ معاف کر دیا۔

بعد کی داستان ذرا دراز ہے۔ مختصر یہ کہ اس ملاقات کے بعد محترمہ وقتاً فوقتاً تشریف لانے لگیں۔ شروع شروع میں والدہ کے ساتھ لیکن جب ہماری برخورداری کا یقین ہو گیا تو اکیلی بھی آ جاتیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارا اندازہ مسز 'خ' کے متعلق کچھ اور ہی تھا، لیکن ان سے ذرا تفصیلی تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ شاید ہم اتنے برخوردار نہیں جتنی مسز 'خ' باکردار ہیں۔ چنانچہ اس انکشاف کے بعد ہمارا دِل اس خاتون کیلئے سراپا احترام و تحسین تھا۔

مسز 'خ' اچھی تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور خوش رو بھی اگرچہ ان کا اصلی حُسن ان کے شگفتہ مزاج، شائستہ عادات اور شیریں گفتار میں تھا، لیکن اس شگفتگی، شائستگی اور شیرینی سے بھی واضح تر حقیقت ان کا شباب تھا جو ان کی بے وقت بیوگی کی وجہ سے سوگوار سا تھا اور انہیں بجا طور پر شریکِ زندگی کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے ہم خود تو چند خانگی مجبوریوں کی وجہ سے اس شرکت سے معذور تھے لیکن مسز 'خ' کے حالات کے پیشِ نظر ان سے ہمدردی بے حد تھی۔ چنانچہ دِل ہی دِل میں اپنے حلقۂ احباب کو اس غرض سے پرکھنے لگے کے شاید ان میں سے کوئی مسز 'خ' کی رفاقت کے قابل ہو۔ ہم پوری نیک نیتّی سے اس کارِ خیر میں مصروف تھے۔ لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ مسز 'خ' بھی۔۔۔ جنہیں ہماری مجبوریوں کا علم نہ تھا۔۔۔ اتنی ہی نیک نیتّی سے یہ اعزاز خود ہمیں بخشنا چاہتی تھیں اور اس زرّہ نوازی کا جاندار شبہ اس وقت ہوا جب ایک دوپہر کو دفتر سے واپس آئے۔

حسبِ معمول ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا لیکن اندر قدم رکھا تو یوں محسوس ہوا کہ اپنے ڈرائنگ روم کی بجائے بہزاد کے سٹوڈیو میں آ نکلے ہیں۔ یہ ہمارا ہی گھر تھا اور ہمارا ہی سامان لیکن اس کی ترتیب و تزئین میں انقلاب آ چکا تھا۔ کمرے کی تصاویر میں ایک نئی کشش تھی، پردوں میں نیا فسوں تھا اور گلدستوں میں نئی تازگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہمارے ڈرائینگ روم میں کہکشاں اُتر آئی ہے اور یہ کہ بنیں گئے اور ستارے اب آسماں کیلئے۔

بیرا محمد دین نمودار ہوا اور بولے بغیر ہی سمجھ گیا کہ کس سوال کا جواب دینا ہے۔ بولا:

"جناب یہ سب کچھ بیگم صاحب نے کیا ہے۔"

"کس کی بیگم صاحب؟"

محمد دین تجربہ کار، صاحب دیدہ اور میم آزمودہ بیرا تھا۔ سوال کا جواب ٹال گیا اور بولا:

"بیگم صاحبہ باورچی خانے میں کھانا تیار کرا رہی ہیں۔"

کچن میں جھانکا تو مسز 'خ' ابھی ابھی کھانا پکوانے سے فارغ ہو چکی تھیں اور باورچی کو آخری ہدایات دے رہی تھیں۔۔۔ ہماری آنکھیں مسز 'خ' کی ممنونیت سے تر ہو گئیں ۔ دفتر کی کوفت کے بعد ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے کمرے میں آئے تو مسز 'خ' بھی کچن

کی کوفت دھو کر گلِ تر کی صورت تشریف لے آئیں۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد اس قدر مفصّل زحمت اٹھانے کی وجہ پوچھی تو بولیں:

"اس گھر کے ماحول سے ایک کرخت مردانہ پن ٹپکتا تھا، سوچا آپ کے نوکروں کا ہاتھ بٹادوں۔"

یہ خاکساری بھی تھی اور دِلربائی بھی۔ کھانا کھا چکیں تو ہم سے وعدہ لیا کہ کل چائے پر آنا ہو گا۔ اتنے میں نائیک صوبہ خان بھی ڈاک خانے سے روپے نکلوا لایا۔ تھوڑی دیر بعد مسز 'خ' رخصت ہونے لگیں تو ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس دفعہ پاس بک کے ساتھ دِل بھی چھوڑے جا رہی ہیں۔ اور ہر چند کہ ہم تابعدار تھے امیدوار نہ تھے۔ ہزار چاہا کہ سواری روک کر کہہ دیں کہ "یہ ہے آپ کا دِل، لیتے جائیے" لیکن ایسی بے باک زبان کہاں سے لاتے؟

اب اس خطا کا احساس ستانے لگا کہ خاتون کو ایک غلط توقع کے ساتھ رخصت کر دیا ہے۔ اگر اس غلطی کی فوری اصلاح نہ کی گئی اور کل چائے پر بھی جا نکلے تو نتائج شادی اور قطع تعلق کے درمیان کوئی شکل اختیار کر سکتے ہیں اور ان حادثات سے ہم ہر صورت بچنا چاہتے تھے۔ بے بسی میں اور کچھ بَن نہ پڑا تو اپنے ہمسائے آنریری کیپٹن 'ش' سے رجوع کیا جو بحرِ عشق کے بین الاقوامی غوّاص تھے۔ آپ نے پہلی شادی پہلی جنگِ عظیم کے دِنوں میں فرانس میں کی تھی۔ آپ کی موجودہ شادی شرعی اعتبار سے

ساتویں اور دوسرے حساب سے ایک سو ساتویں تھی۔ سرکار نے آپ کو پنشن سے بلا کر ریکروٹنگ کا کام دے رکھا تھا جسے آپ خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ یعنی ہر دوسری بیوی کے بعد ایک ریکروٹ بھرتی کر کے فوج کے حوالے کر دیتے۔

کیپٹن 'ش' نے ہماری پپتا سُنی تو بحرِ فکر میں ڈوب گئے لیکن آنکھ کھلی تو معلوم ہوا پہلے غوطے میں ہی لولوئے لالا لائے ہیں۔ فرمانے لگے:

"جاؤ تمہاری مشکل آسان ہو گئی ہے۔ خاتون تمہاری محبّت سے شفا پائے گی۔ بے کھٹکے جا کر چائے پیو۔ فقیر نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔"

دِل میں شکوک تو بہت پیدا ہوئے لیکن اس پوشیدہ مگر مہربان ولی پر جرح کرنا گستاخی تھی۔ لہٰذا چُپ رہا۔ دوسرے دن محترمہ کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو چائے کا انتظام تو تھا لیکن چاہت کا بندوبست نہ تھا۔ جذبۂ شوق کی متوقع گرمیوں کی بجائے اچھی خاصی سردیاں بپا تھیں۔ والدہ محترمہ کا سانس سینے کی بجائے فریجڈیئر سے نکلا محسوس ہوتا تھا۔ مسز 'خ' کی گفتگو بھی خاصی ائر کنڈیشنڈ تھی اور سارے گھر کا ماحول یخ بستہ نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے قطب شمالی میں آنکلا ہوں، بلکہ آہستہ آہستہ مادر مہربان اپنی گہری بکل میں اسکیمو نظر آنے لگیں۔ گھر کی بلّی مسلسل چھینکوں سے نمونیہ زدہ معلوم ہونے لگی۔ چائے کا گھونٹ پیا تو منہ ہی میں جم گیا۔ رخصت کی اجازت مانگی تو

جیسے بِن مانگے ہی مِل گئی۔ دروازے سے باہر نِکلا تو مادر مہربان کنڈی لگانے سے پہلے بولیں:

"ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ جواری، شرابی اور کبابی ہیں۔۔۔" اور دروازہ ٹھک سے بند ہو گیا!

تو یہ تھی اس پوشیدہ ولی کی کارستانی! کم بخت نے ہماری شادی تو ٹال دی لیکن ہمیں بدنام کر کے محترمہ کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا۔ بلکہ مستقل طور پر شادی کے لئے نااہل کر دیا۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ہم اپنی ہی زبان سے معذوری کا اظہار کر دیتے یا شادی ہی کرا لیتے، خواہ بعد میں برادری سے خارج کر دیئے جاتے۔ چنانچہ آگ بگولا ہو کر ہم اس آنریری کذاب کے پاس گئے اور کڑک کر کہا:

"او! پرانے زمانے کے متروک سے کپتان، محترمہ سے شادی کر کے ہم حقّہ پانی بند کرا لیتے یا پھولتے پھلتے، تم نے ہمارے خلاف یہ سہ نکاتی جھوٹ کیوں بولا؟ تم سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ ہم جواری، شرابی اور کبابی ہیں؟ ایک شریف زادے پر یہ تہمت؟"

کیپٹن 'ش' مسکرائے اور تواضع سے کرسی پیش کی، مگر ہم کھڑے رہے اور بگڑے رہے۔ آخر وہ سینے پر ہاتھ رکھ بولے:

”دیکھو صاجزادے۔ اوّل تو ان تین لفظوں میں کوئی تہمت کی بات نہیں۔ افسر لوگ ہر شب کلب میں برِج کھیلتے ہیں جو بڑا جائز سا جُوا ہے۔ کبھی کبھی بیئر کا گھونٹ بھی پی لیتے ہیں جو ایسی حرام شے نہیں اور کباب تو خیر اسلام میں ہیں ہی حلال۔ سو جو کچھ میں نے کہا ہے وہ اتنا جھوٹ بھی نہیں اور اتنا سنگیں بھی نہیں۔ میں نے تو محض سنگین لفظوں کا فائدہ اٹھایا ہے اور تمہاری خاطر ایک کارنامہ انجام دیا ہے یعنی عارضی طور پر مسز 'خ' کی محبّت کا رُخ کسی دوسرے شخص کی طرف موڑ دیا ہے۔ اب جب چاہو انہیں صحیح بات بتا کر غلط فہمی دور کی جاسکتی ہے۔“

کیپٹن 'ش' کی بات ہمیں ذرا معقول یا کم نامعقول نظر آئی۔ خصوصاً اسلئے کہ اس نے محترمہ کی محبّت کا رُخ کسی دوسرے شخص کی طرف موڑ دیا تھا۔ گویا اب مسز 'خ' کی شادی کا امکان تھا جو ہماری اپنی سکیم کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے غصّے کی لے کو ذرا مدھم کرتے ہوئے کہا:

”اچھا یہ تو کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے اور ہاں وہ محبّت کا رُخ کس طرف موڑا ہے؟“

کیپٹن 'ش' کے ہونٹوں پر ایک اوباشانہ تبسّم نمودار ہوا اور بولا:

”دولہا تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“

ہم ایک لمحے کیلئے لڑکھڑا گئے اور آج تک پچھتا رہے ہیں کہ اس راسپوتین کی طرف کیوں رجوع کیا۔

آپ پوچھیں گے اس شادی کا انجام کیا ہوا۔۔۔ وہی جو ایک سو آٹھویں شادی کا ہونا تھا!

# سفارش طلب

آغا میرے بے تکلّف دوست ہیں۔ اصول کے بندے ہیں، بلکہ اپنی اصول پرستی کیلیئے بدنامی کی حد تک مشہور ہیں۔ پچھلے دنوں میں ان سے عارضی طور پر ناراض سا تھا۔ لیکن وہ ایک شام بمعہ بے تکلّفی آوارد ہوئے اور میری ظاہری سرد مہری کو نظر انداز کرتے ہوئے میرے ملازم کو حسبِ معمول چائے کا حکم دیا اور پھر مجھ سے ذرارازدارانہ لہجے میں کہنے لگے:

”چوہدری، ایک ضروری کام سے آیا ہوں اور کام یہ ہے کہ ایک جگہ ڈاکہ ڈالنا ہے۔ ساتھ دوگے؟“

آغا جیسے دیانت زدہ شخص کی طرف سے ڈاکے کی دعوت! میں نے سوچا ضرور اس میں کوئی پیچ ہے۔ کہا:

”ہوش میں ہو آغا؟ معلوم ہے ڈاکہ کیسا فعل ہوتا ہے؟ اور پھر مجھے دعوت دیتے حیا نہیں آتی؟ڈاکو بناتے ہو؟“

آغا کرسی پر ذرا اور دراز ہو کر بولے:

"بس۔ بس۔ بس۔ اتنا کافی ہے۔ خفا مت ہو۔ کل تم نے مجھے ڈاکے کی دعوت دی تھی، آج میں نے دے دی۔ میں تمہاری نہ مانا، تم میری نہ مانو۔ جھگڑا ختم۔ ہاں ذرا چائے جلد نکلے۔"

مجھے سچ مُچ شک ہوا، آغا کا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے کہا:

"تم کیسی باتیں کرتے ہو آغا؟ میں نے تجھے ڈاکے پر اُکسایا؟"

بولا: "ہاں۔ تم نے اپنے مولوی زادے کی سفارش نہیں کی تھی کہ اسے کلرک بھرتی کر لو؟"

اب سفارش تو میں نے ضرور کی تھی، لیکن یہ ڈاکہ کیوں کر ہوا؟ لیکن میں کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ بولے:

"دیکھو چوہدری، سفارش کر کے تم نے کسی دوسرے کا حق اپنے مولوی کے لونڈے کو دلانا چاہا تھا اور کسی کا حق چھیننا ہی ڈاکہ ہے۔ اس ڈاکے سے تمہیں بچا لیا اور تم اس روز سے مُنہ پھلائے بیٹھے ہو۔"

تو یہ ساری تمہید آغا نے ہمیں زِچ کرنے کو اٹھائی تھی، اور جب ہم نے ایک لمحے کیلئے ٹھنڈے دِل سے سوچا تو محسوس ہوا کہ آغا سچا ہے اور ہم زِچ ہو چکے ہیں۔ پر جتنا مزید سوچا اتنی ہی پرانی سفارشیں جو کی تھیں یا مانی تھیں یاد آ گئیں۔ گویا وہ تمام ڈاکے جن میں شریک ہوا تھا، آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ آغا نے ہمارے منہ پر ہوائیاں اُڑتے دیکھیں تو بولے:

"ندامت محسوس کرتے ہو؟ واللہ ضرور کرو، اور آئندہ کیلئے توبہ بھی۔"

یہ عرصے کی بات ہے لیکن اب بھی جب بھی سفارش کا ذکر چھڑتا ہے یا کوئی سفارش طلب آ نکلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کسی ڈاکے کی واردات ہو گئی ہے یا ہونے والی ہے۔ لیکن کاش آغا نے میرے علاوہ باقی دنیا کے سفارش طلبوں کی اصلاح بھی کر دی ہوتی۔ ان ڈاکوؤں میں کسی طرح کمی آتی دکھائی نہیں دیتی۔ دنیا میں وبائیں پھوٹ نکلتی ہیں اور آخر میں ختم جاتی ہیں۔ جنگیں چھڑتی ہیں اور آخر صلح ہو جاتی ہے، لیکن سفارش کا سیلاب ہے کہ ہر وقت طغیانی پر ہے اور جس قدر روکو اور تند ہوتا ہے۔ غالب کے زمانے میں بھی اگر سفارش طلبوں کی بارش کا یہی عالم ہوتا جو آج ہے تو وہ اپنا معروف شعر ذرا مختلف طور پر کہتے:

پاتے نہیں گر راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

رکتی ہے سفارش تو یہ ہوتی ہے رواں اور

اور کس کس پایہ اور پیرایہ کے سفارش طلب ہیں! سب سے پہلے ہمارے مولوی صاحب کو ہی لے لیجئے جن کی سفارش طلبی نے مجھے آغا کے سامنے شرمندہ کیا۔ مولوی صاحب ہمارے گاؤں کے امام مسجد ہیں۔ خاص عیّار آدمی ہیں، لیکن نماز باقاعدگی سے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور گاؤں کے معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کے معزز بننے میں انکی نمازوں کا زیادہ حصّہ ہے یا ان کی عیّاری کا۔ پچھلی مرتبہ گاؤں گیا تو فرمانے لگے:

"برخوردار نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ تھا تو کمزور ہی لیکن خدا کے فضل سے۔۔۔ یعنی سفارش کے فضل سے۔۔۔ پاس ہو گیا ہے۔ تیسرا ڈویژن لیا ہے۔ اب مہربانی کر کے اسے کلرک بھرتی کرا دیں۔"

میں نے خدا جانے اس وقت تو کیا کہا اور واپسی پنڈی آ گیا لیکن چند ہی روز بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا جُبّہ و دستار پہنے، ڈاڑھی سنوارے، یا بقول حسرت مرحوم، چہرے پر قراردادِ مقاصد لٹکائے صاحبزادے کی اُنگلی پکڑے، خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں اور آتے ہی بغیر تمہید کے فرماتے ہیں:

”یہ ہے برخوردار۔ اب آپ جانیں اور یہ۔ ہم نے آپ کے گاؤں کی خدمت کی ہے۔ مسجد آباد کر رکھی ہے۔ درسِ قرآن دیتے ہیں۔ تین نابینوں کو پنج سورہ حفظ کرایا ہے۔ دو بیواؤں کی شادی کرائی ہے۔ اب ہماری خدمت کے معاوضے کا وقت ہے۔“

یہی تھی وہ تقریر جس کے جال میں آکر میں نے آغا سے سفارش کر دی تھی اور اس کا جو نتیجہ نکلا اس کا آپ کو علم ہی ہے۔

سفارش کے جراثیم مکھّی مچھّر یا چوہے نہیں پھیلاتے، اپنے اقرباء اور دوست پھیلاتے ہیں۔ اچانک ایک اجنبی رقعہ لے کر آتا ہے جس پر ”اشد ضروری اور بصیغہ راز“ جیسے تاکیدی الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ آپ خط کھولے بغیر ہی سمجھ جاتے ہیں کہ چچا جان کی جانب سے ایک اور سفارش نازل ہوئی ہے اور حامل رقعہ ہوں لگتا ہے جیسے سفارش کے طاعون کا ایک اور چوہا گرا ہو۔ آپ لفافہ کھول کر پڑھتے ہیں تو لکھا ہے:

”عزیزِ مَن۔ حامل رقعہ شیخ حاضر دین میرے ایک دوست کے داماد ہیں۔ بڑے شریف آدمی ہیں۔ اتّفاق سے ان پر چینی بلیک کرنے کا مقدمہ بن گیا ہے جس کی تفتیش مسٹر انصاری کر رہے ہیں جو بد قسمتی سے دیانتدار قسم کے آدمی ہیں اور کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ مگر پتہ چلا ہے کہ تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ ہم جماعتوں کا ایک دوسرے پر بڑا حق ہوتا ہے۔ اس وقت انصاری سے ملو اور شیخ صاحب کی گلو خلاصی کرا

دو، ورنہ شریف آدمی مُفت میں جیل میں سڑتا رہے گا۔ آخر کون ہے جو آج کل بلیک نہیں کرتا؟

والسلام"

کتنے بھولے ہیں آپ کے چچا جان۔ چونکہ حاضر دین اُن کے دوست کے داماد ہیں، لہٰذا چور ہوتے ہوئے بھی چور نہیں بلکہ شریف آدمی ہیں اور اتنے شریف کہ جیل میں قدم رکھا تو گل سڑ جائیں گے۔ وہ صرف چینی کی بوری میں پھولتے پھلتے ہیں۔۔۔ اور ہاں کتنا پاجی ہے یہ مسٹر انصاری جو دن دہاڑے دیانتداری سے کام کرتا ہے۔ رہے آپ تو اگر آپ نے شیخ حاضر دین کو اس ظالم انصاری کے پنجے سے آزاد نہ کرایا تو آپ سا نالائق بھتیجا تیسری دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔۔۔ دراصل چچا جان اتنے بھولے نہیں جتنے خطرناک ہیں۔ ایسے جراثیم بردار چچا کو اولین فرصت میں ڈی ڈی ٹی سے نہلانا چاہیے کہ اگر وہ خود اس غسل سے بچ بھی نکلیں تو ان کے جراثم تو تلف ہو جائیں۔

چند سفارش طلب بلیک میل کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ آپ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں کہ دروازے پر سواری رکتی ہے۔ ایک حضرت ہنستے کھیلتے کار سے اُترتے ہیں اور نہایت بے تکلّفی سے آپ کو دور ہی سے سلام پھینکتے ہیں۔ قریب آکر صرف ہاتھ ہی نہیں ملاتے، معانقے کے لئے بازو بھی کشادہ کرتے ہیں۔ (معانقے سے بچنا آپ کی قسمت یا ہاتھ کی صفائی پر منحصر ہے) بچّوں کو نام سے بُلا کر ایک ایک کو گود میں لیتے

ہیں۔ اپنی عمر کے مطابق بھابی یا بٹیا کا مزاج دریافت کرتے ہیں اور اگر وہ باہر نہیں آتیں تو حیرت سے کہتے ہیں: "ارے مجھ سے پردہ! چچا سے؟" اندر جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ کے حواس ابھی بجا ہیں تو کوئی بہانہ کر دیتے ہیں کہ اس وقت گھر میں نہیں۔ ہمسائی سے ملنے گئی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور آپ کو یہ معلوم نہیں کہ یہ ذات شریف ہیں کون؟ اور اس بے تحاشا بے تکلفی کے بعد آپ ان سے پوچھا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ آپ کی زبان سے صرف اتنا نکلتا ہے کہ "مزاج اچھے ہیں؟" آپ کے جواب میں وہ نہ صرف اپنے مزاج کی داستان سناتے ہیں بلکہ اپنے ریاض، نواز، جمیلہ اور موتی کتّے تک کی کیفیتِ مزاج بیان کر دیتے ہیں اور آپ کے تمام رشتہ داروں کے تازہ کوائف بھی پیش کر دیتے ہیں۔ آپ حیرت سے ان کا منہ تکتے ہیں اور ابھی سنبھلنے بھی نہیں پاتے کہ سفارش پیش ہو جاتی ہے:

"ہاں بھی تو تم نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ ہم آئے کیسے ہیں؟ وہ جانتے ہو نا اپنے مرزا صاحب۔ ارے جن کے ہاں اپنے حمید کی منگنی ہوئی ہے۔ انہوں نے ٹھیکے کیلئے ٹینڈر دے رکھا ہے اور سنا ہے تم کل صبح ہی یہ ٹینڈر کھول رہے ہو۔ بس یوں سمجھو کہ خود ہمیں نے ہی ٹینڈر دیا ہے۔"

آپ حیران ہوتے ہیں کہ جان نہ پہچان۔ اتنا بڑا جرم اور اس صفائی اور بے تکلّفی سے ارتکاب۔ لیکن آپ ابھی کچھ سوچ ہی رہے ہوتے ہیں کہ ارشاد ہوتا ہے: "بھئی کہیں

بہت زیادہ قاعدے قانون کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ آج کل یہ عارضہ عام ہونے لگا ہے۔ کوئی بات کہو، مانتے ہی نہیں۔ ملک، قوم، پاکستان کا رونا شروع کر دیتے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے تمہارا دماغ ابھی سلامت ہے۔ اخ اخ اخ۔۔۔ اور زور سے آپ کا کندھا تھپکاتے ہیں۔ گویا پیشگی آپ کو بتایا جارہا ہے کہ آپ کا انکار دیوانگی کی علامت ہو گی اور اس کے بعد اگر واقعی عذر کرتے ہیں تو حضرت ایک اور قہقہہ لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"میں نہ کہتا تھا، یہ بیماری آج کل عام ہے۔ ہر بات میں پاکستان۔ ارے میاں پاکستان کا اللہ مالک ہے۔ اس طرح دنیا کے کام نہیں چلتے۔ ہم تم دنیادار آدمی ہیں۔ ہم قائداعظم تھوڑے ہی ہیں۔ لو، ہاں کر لو۔"

سادہ لفظوں میں اس فلسفے کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کے چلانے کی تمام تر ذمّہ داری اللہ پر ہے۔ دیانت داری فقط قائداعظم کیلئے ہے اور ہمارا کام صرف دنیاداری ہے۔ لفظ دنیاداری تین اجزاء کا مرکّب ہے: چوری، رشوت اور خویش پروری کا۔۔۔ ایسے سفارش طلبوں سے گلوخلاصی کا موثر طریقہ ایک ہی ہے کہ آپ مسکرا کر ان کا بازو تھامیں۔ انہیں گھر کے دروازے تک لے جائیں اور ایسا کرتے ہوئے انہیں کھینچنے یا لیٹنے کی ضرورت پڑے تو یہ ضرورت بھی پوری کریں اور آخر پھاٹک پر پہنچ کر خندہ پیشانی

سے خدا حافظ کہیں اور پھاٹک کے باہر کر دیں اور لازم نہیں کہ اس عمل میں فقط ہاتھوں سے کام لیں۔

کلامِ اقبال ہر جگہ امرت دھارا کے طور پر استعمال ہوتا ہے چنانچہ سفارش طلبوں کے ایک حلقے کا انحصار بھی اقبال کے استعمال پر ہے۔۔۔ ایک دن چھٹی کے روز چمن میں بیٹھے دھوپ میں ستا رہے تھے کہ ایک حضرت جو دور ہی سے بڑے نستعلیق سے عالم نظر آتے تھے، آوارد ہوئے اور نظریں چار ہوتے ہی فرمایا:

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

محبّت حُسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

انداز سے پتہ تو چل گیا کہ حضرت سفارش طلب ہیں لیکن گھر آئے تھے۔ کرسی پیش کی اور شانِ نزول دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ جناب نے عساکرِ پاکستان کیلئے بڑی بے نظیر کتاب لکھی ہے، 'مردِ مجاہد' اور خاکسار سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ فوجی فنڈ سے صرف دس ہزار نسخے خریدے اور فوج میں تقسیم کر کے ثوابِ دارین حاصل کرے۔

کتاب کا ہدیہ فقط پندرہ روپے فی جلد ہے۔ گویا ڈیڑھ لاکھ کی معمولی رقم میں ساری فوج کی مع کمانڈر انچیف کے عاقبت سنور جائے گی۔۔۔ یہ کہہ کر مولانا نے اپنے تھیلے سے قصّہ سسّی پُنّوں کے حلیئے کی ایک بے جلد کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ کتاب

دیکھنے پر میرا صدمہ اس قدر واضح تھا کہ مولانا نے جھٹ کلامِ اقبال سے ایک اور خوراک پیش کی:

نگہِ کم سے نہ دیکھ اس کی کج کلاہی کو

یہ بے کلاہ ہے سرمایۂ کلاہ داری !!

میں نے کہا: "قبلہ کتاب میں تو کوئی خرابی نہیں۔ چھپائی دن کی روشنی میں بخوبی پڑھی جا سکتی ہے، احتیاط سے ورق اُلٹے جائیں تو کاغذ بھی نہیں پھٹے گا اور صرف ایک کتاب خریدی جائے تو شاید قیمت بھی برداشت کی جا سکتی ہے۔ خرابی صرف یہ ہے کہ اس خاکسار کو دس ہزار نسخے خریدنے کا اختیار نہیں۔"

فرمانے لگے : "لیکن جن کو اختیار ہے وہ تو آپ کے دوست اور رفیق کار ہیں۔ آپکی سفارش بھی رد نہ کریں گے۔"

عرض کیا: "لیکن جناب سفارش کرنا بھی ایسا مستحسن فعل نہیں ہے اور تعجّب ہے کہ آپ پیرِوِ اقبال ہو کر سفارش کے محتاج ہیں۔"

بولے: "سفارش تو اقبال بھی کرتے تھے انہوں نے اپنے متعلق فرمایا ہے:

وہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا"

عرض کیا: ” قبلہ انہوں نے تو ایک چیونٹی کو مشورہ دیا تھا کہ سلیمان کے پاس بھی حاجت لے کر نہ جائے۔ شاید وہ شعر بھی آپ کو یاد ہو۔“

بولے: ”یاد ہے مگر اسی لئے سلیمان کے پاس نہیں گیا، آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ ہی سے تو نیاز مند کی امیدیں وابستہ ہیں۔۔۔“ ساتھ ہی آنکھوں میں نم لا کر ذرا رُندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے:

”بتا تو کیا مرا ساقی نہیں ہے؟“

میں اس گہری جذباتی اپیل کے لئے تیار نہ تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو اضطراراً میرے منہ سے نکل گیا:

مرے شیشے میں مے باقی نہیں

اس پر آپ نے ایک یاس انگیز نگاہ آسمان پر ڈالی۔ کتاب سنبھالی اور ایک بھرپور ناراضگی کے عالم میں یہ کہتے ہوئے چل دیئے:

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں

ایک بھی صاحبِ سرور نہیں!

سفارش کی مکروہ ترین شکل غالباً وہ ہے جس میں سفارش طلب اپنی بیوی کو استعمال میں لاتا ہے۔ ممکن ہے بیوی بچاری کا اس میں کوئی قصور نہ ہو، لیکن سفارش طلب کی غیرت اتنی بے قصور نہیں ہوتی اور سفارش قبول کرنے والے کیلئے تو یہ ایک آزمائش کی کڑی گھڑی ہوتی ہے۔ مثلاً آپ باہر سے گھر آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت ہی معقول شکل اور خوش پوش خاتون تشریف فرما ہیں جنہیں آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا، بلکہ اب بھی غلطی سے آپ کے سامنے آگئی ہیں اور بس رخصت ہونے ہی والی ہیں۔ جب بعد میں آپ اپنی بیگم سے مہمان کا نام اور انکی آمد کا مقصد پوچھتے ہیں تو پتہ چلا ہے کہ کوئی تین گھنٹوں کی نشست کے بعد رخصت ہوئی ہیں۔ بچّوں کیلئے کھلونے لائی ہیں۔ سارے کنبے کو کھانے کی دعوت دے گئی ہیں۔ کوئی غرض نہیں تھی، محض خلوص کی فراوانی کھینچ لائی تھی۔ نام بیگم 'ص' بتا کر گئی ہیں۔ یہ سُنتے ہیں تو آپ کا ماتھا ٹھنکتا ہے: 'ص' یہ تو وہی ذات شریف ہیں جو دفتر سے سٹیشنری چرانے کے جرم میں ماخوذ ہیں۔ تفتیش ہو رہی ہے۔ برخواستگی یا تنزّل کا امکان ہے۔ اس عبرتناک انجام کو ٹالنے کیلئے 'ص' صاحب خود تو خدا سے لے کر خاکسار تک کا خوشامد سے گھیراؤ کر رہے ہیں، اب بیگم 'ص' کو بھی اس کارِ ثواب میں شامل کر لیا ہے۔

اور بیگم 'ص' جیسی خاموش طبع خواتین تو پھر قابلِ برداشت ہوتی ہیں۔ معاملہ نازک اس وقت ہو جاتا ہے جب محترمہ ذرا تیز مزاج یا تلخ نوا ہوں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بغیر بات نہ کر سکیں۔ انکے سامنے اگر آپ نے بلا تاخیر ہتھیار ڈال دیے تو خیر،

ورنہ خیر نہیں۔ ایک رن پڑنے لگے گا۔ ایک محشر بپا ہو جائے گا۔ ان پانچ بچّوں کی معصومیت اور تعداد کی دہائی دی جائے گی جن میں سب سے بڑا پانچ سال سے کم عمر کا ہے۔ مجرم خاوند کے جرموں کا اعتراف بھی کر لیا جائے گا، لیکن ان معصوموں کی خاطر اس سیاہ کار کے گناہوں کو نظر انداز کرنے کی سفارش کی جائے گی۔ اس پر آپ کا دِل پگھل جانا چاہیئے۔ ایسا نہ ہوا تو گریہ وزاری کی ابتدا ہو جائے گی۔ آپ منّتیں کریں گے کہ محترمہ رونا بند کریں، لیکن محترمہ اور روانی اور فصاحت سے نالہ کھینچیں گی۔ اگر آپ اب بھی نہ مانے تو شاید بد دعاؤں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس مقام پر آپ کے قدم ڈگمگا جائیں گے۔ کلیجہ ہل جائے گا۔ دِل دہل جائے گا۔ خاتون جیت جائے گی اور آپ ہار جائیں گے۔

سفارش طلب سے نمٹنے کے کئی طریقے ہیں۔ بعض آدمی گلو خلاصی کیلئے نہایت فیاضی سے جھوٹا وعدہ کر دیتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں، لیکن یہ بزدلوں اور مصلحت کوشوں کا طریقہ ہے۔ آپ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا ورنہ آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو ہمارے دوست کرشن چندر کا ہوا اور قصّہ کرشن چندر کا خود اس کی زبانی سنئے:

ایک مرتبہ میں لاہور میں ایک معمولی سا ٹیچر بن گیا، لیکن گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ پروفیسر ہو گیا ہوں۔ چنانچہ سفارش کا تانتا لگ گیا۔ سب سے پہلے ایک پرانے ہم

جماعت بلوچ خان آ گئے۔ بولے: "منشی فاضل کا امتحان دیا ہے۔ دوسرا پرچہ بہت نکما ہوا ہے۔ پروفیسر قاضی صاحب ممتحن ہیں۔ انہیں کہہ کر پاس کرادو۔"

ایک روایت کے مطابق پروفیسر قاضی صاحب تک ان کی بیوی بھی مشکل سے پہنچتی تھی۔ میری رسائی سے تو وہ سراسر باہر تھے، لیکن بلوچ خان کو ٹالنے اور کسی حد تک اپنی پروفیسری کا رعب جمانے کیلئے کہہ دیا:

"ارے قاضی۔ وہ تو ہمارا لنگوٹیا ہے۔ تمہیں فرسٹ ڈویژن دلوادیں گے۔"

اس کے بعد بلوچ خان سے سرخروئی کی خاطر دعائیں تو بہت مانگیں لیکن وہ فیل ہو گیا اور جب بلوچ خان نے نتیجہ سُنا تو مجھے فوراً لکھا: اب گاؤں کبھی نہ آنا ورنہ مار ڈالوں گا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ مرے ہمسائے پنڈت شِونائن اپنے بیٹے کی سفارش لے کر آ دھمکے ۔بولے: "کاکے پرکاش نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ تاریخ کا پرچہ ذرا گڑبڑ ہو گیا ہے۔ شرما صاحب کے پاس پرچہ ہے انہیں اشارہ کر دیجئے گا۔"

اشارے کے لفظ سے ظاہر تھا کہ پنڈٹ جی کے ذہن میں میرے رسوخ کا بلند تصوّر ہے۔ چنانچہ اس وقت تو کہہ دیا کہ فکر نہ کریں پنڈت جی، شرما سے کان پکڑ کر لڑکے کو پاس کرادوں گا لیکن حقیقت یہ تھی کہ شرما صاحب کے کان میری گرفت سے یکسر باہر تھے۔ بہرحال مجھے معلوم تھا کہ لونڈا فیل تو ہو ہی جائے گا چنانچہ اپنی بریت اور

کارگزاری دکھانے کیلیئے ایک ترکیب نکالی۔۔۔ایک دن پنڈت جی اور پرکاش کو بُلا بھیجا اور کسی قدر جلال میں آکر پنڈت جی سے خطاب کیا:

واہ پنڈٹ جی واہ۔ آپ نے ہماری خوب کرکری کرادی۔ شرما صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے پرچہ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ تم خود ہی انصاف سے جو چاہو نمبر دے دو اور پرچہ دیکھتا ہوں تو اوٹ پٹانگ لکھا ہے۔ اکبر کے بیٹے کا نام دین الٰہی تھا اور اشوک لاٹھیں بیچا کرتا تھا۔ جہانگیر کبوتر پالتا تھا اور لارڈ ہیسٹنگز تیز دوڑتا تھا اس کے علاوہ ہجے غلط، املا خراب۔ خدا جانے یہ لونڈا سارا سال کیا کرتا رہا ہے؟

اس پر ہماری کارگزاری سے مطمئن ہو کر پنڈت جی نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور پرکاش کے رسید کرتے ہوئے فرمایا:

کم بخت تاش کھیلتا رہاہے۔ اور کیا کرتا رہا ہے؟

لیکن جب کچھ روز بعد نتیجہ نکلا تو پرکاش پاس ہو گیا اور پھر باپ کا ڈنڈا لے کر میری تلاش میں پھرنے لگا۔

سفارش طلب سے نبٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے چور سمجھا جائے اور اسکے ساتھ چور کا سا سلوک کیا جائے۔ جونہی اس کے منہ سے سفارش کا کلمہ نکلے آپ سر پر باہیں رکھ کر "چور ہے۔ چور ہے" چلانا شروع کر دیں۔ ہمسائے اکٹھے کر لیں۔ قریب فون ہے تو

پولیس کو اطلاع کریں بلکہ فائر بریگیڈ کو بلانے کی کوشش کریں۔ سائرن بجائیں۔ اگر سفارش طلب بھاگنے کی کوشش کرے تو اس سے گتھم گتھا ہو جائیں۔ اگر آپ اسے گرفت میں نہ لا سکیں تو کم از کم اس کی پگڑی یا ٹوپی ضرور نوچ لیں اور پھر اس کا یا اس کی ٹوپی کا جلوس نکالیں۔ اگر پاکستان میں ایسے دو تین واقعات ہو جائیں اور اخباروں میں مع تصویر چھپ جائیں یا ٹی وی پر دکھائے جا سکیں تو وطنِ عزیز سے سفارش کا چار دن میں قلع قمع ہو جائے گا۔

# پردیسی نال نہ لایئے یاری

پروفیسر اعجاز حسین، جنہیں ہم چچا کہتے ہیں، کوئی ساٹھ برس کے پیٹے میں ہیں لیکن کبھی جوان بھی تھے۔ اور جوان بھی ایسے رعنا، خوب رُو اور خوش پوش کہ جس بستی سے گزر جاتے وہاں کے حسینوں میں مدتّوں ہلچل رہتی۔ ان کے شباب کا ایک قصّہ بڑی شہرت حاصل کر چکا تھا، یعنی ان کا اور ایک ہندو لڑکی موتیا کا رومان۔ ہمیں ارمان تھا کہ یہ داستان ہم خود چچا کی زبانی سُنیں کہ وہ غضب کے داستان گو بھی تھے۔ اگرچہ بظاہر کم گو تھے۔ ایک دن چچا خلافِ معمول موج میں تھے۔ ہمیں شرارت سوجھی اور چچا سے کہا:

”چچا، آپ کی موتیا کا قصّہ تو کچھ فرضی سا لگتا ہے۔ وہ ہندو تھی آپ مسلمان۔ اپنوں کو چھوڑ کر اس کی آنکھ بھرے شہر میں آپ ہی سے کیوں لڑی؟“

عام حالات میں چچا ایسے سوال گول کر جاتے تھے لیکن آج کا سوال صرف سوال ہی نہ تھا، چیلنج بھی تھا۔ چچا بول اٹھے:

"برخوردار، اگر بھرے شہر میں موتیا کی آنکھ ہم سے لڑی اور ہماری موتیا سے تو اس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں کے سوا بھرے شہر میں کسی کو آنکھ لڑانے کا سلیقہ ہی نہ تھا!"

"لیکن اتنا بڑا سنگین واقعہ کب اور کیسے ہوا؟" ہم نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا۔

چچا کی طبیعت آج بلاشبہ رنگ پر تھی۔ ایک سکون بخش کش کے بعد حقّے کی نَے کو ایک طرف کرتے ہوئے بولے:

"بھئی قصّہ تو ہم سناتے ہیں، لیکن درمیان میں ٹوکنا مت اس طرح کہانی میں روانی نہیں آتی۔"

ہم تینوں شنوندگان یعنی نعیم، نیاز اور میں نے بہ صمیمِ قلب خاموش رہنے کا اقرار کیا اور چچا نے داستان کا آغاز کیا۔

یہ قیام پاکستان سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔ ہم نے تازہ تازہ ایم اے پاس کیا تھا اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے تھے۔ یہ کالج سرکار نے ایک پس ماندہ علاقے کی اشک شوئی کے لئے ایک واماندہ سے قصبے، بالا پور میں کھول رکھا تھا جہاں پہنچنے کے لئے تہذیب اور فیشن کو گاڑی سے اُتر کر کئی میل پیدل چلنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے دوپٹے ابھی تک بے تحاشا سینوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور ایک قمیص

کی کشادگی میں سارا کنبہ سما سکتا تھا۔ سارے شہر میں کوئی ایسا دوپٹہ نہ تھا جو کسی مرمریں گردن میں حمائل ہو یا کوئی ایسی قمیص جو کسی سیمیں کمر میں پیوست ہو۔ رہے مرد تو پہلی نگاہ پر موہنجوڈارو کے مہاجر نظر آتے تھے، حتیٰ کہ ہمارے کالج کے اکثر استادوں کا بھی ایک پاؤں ابھی پتھر کے زمانے ہی میں تھا۔ فقط پرنسپل صاحب جو ولایت سے ہو آئے تھے۔ رنگ و بو کی دنیا دیکھ چکے تھے، لیکن سکھ ہونے کی وجہ سے آنکھ لڑانا ان کے مشاغل میں سے نہ تھا۔ کم از کم بالاپور میں ہمارے مقابلے پر ان کی رقیبانہ جسارت بے کار تھی۔ کچھ یہ بھی کہ پانچ بچّوں کے باپ تھے اور ان کے غنچہ ہائے امید کِھل چکے تھے۔ اور ہم خود بچّے تھے اور ہمارے گلوں میں ابھی رنگ بھرنا باقی تھا۔

ہم سیدھے لاہور سے ایم اے اقتصادیات کر کے آئے تھے۔ ایم اے کرنے کے باوجود ہم اقتصادیات کا تو کچھ نہ بگاڑ سکے لیکن ہماری نفاستِ طبع نے فیشن کے نصیب سنوار دیے۔ چنانچہ اقتصادیات میں تو ہماری شہرت نے کبھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جھانکا لیکن ملبوسات کی دنیا میں ہمارا ذکر ان درباروں تک پہنچ گیا جہاں ہم خود نہیں پہنچ پائے تھے۔ اہلِ بالاپور کی آنکھیں ہم نے پہلے روز ہی خیرہ کر دیں۔ ہم جب کبھی اپنے مکان سے نکلتے، تو بالاپور کے لوگ ہمیں اور ہمارا ملبوس دیکھنے کے لئے رُک جاتے اور ہم نظریں جھکائے خلقِ خدا سے خراج وصول کرتے گزر جاتے۔ ادھر اُدھر ہمیں دیکھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کچھ دیکھنے ہی کو نہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی مقامی گدڑی میں بھی کوئی لعل ہو لیکن کون گدڑی کھولتا اور لعل کو ٹٹولتا مگر ایک دِن۔۔۔ اور وہ کس

قدر تقدیر ساز دن تھا۔ ہم نے مکان سے نِکل کر گلی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ہمارے سامنے سے ایک گدڑی کا لعل گزرا، یعنی گدڑی کی جگہ دھانی، شیفون کا دوپٹہ، ایک مختصر سی ریشمی شلوار اور مختصر تر ریشمی قمیص اور ان تین کپڑوں کے اندر ایک سرو قامت اور مہ طلعت لعل! گزرتے گزرتے ہم پر ایک غلط انداز سی نگاہ ڈالی اور بس ایک ہی نگاہ میں ہماری یکتائیت کا خاتمہ کر دیا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ بے شک بالاپور میں ہمارے سوا کوئی اور بھی ہے اور ہمیں اس نے قصبے کے لاشریک خراج گیر نہیں۔

ہم نے اپنے نوکر راجو سے پوچھا تو دیہاتی عشق بازوں کی زبان میں کہنے لگا:

"نیا مال ہے۔ لاہور یا دلّی سے آیا معلوم ہوتا ہے۔"

راجو ہمارا نوکر بھی تھا اور بچپن کا ساتھی بھی، لہٰذا بے تکلّف تھا۔

خدا جانے اس روز ہم کیوں دِن بھر بے قرار سے رہے۔ پچھلے پہر جب راجو یہ معلوم کر کے لایا کہ لڑکی ہندو ہے اور نام اس کافرہ کا موتیا ہے۔ تو ہماری بے قراری کو قطعاً افاقہ نہ ہوا۔

دوسرے روز ہم کالج سے واپس آ رہے تھے کہ سامنے سے پھر وہی بت طنّاز آتا دکھائی دیا۔ اب کے نہ صرف آسمانی رنگ کا سوٹ زیبِ تن تھا بلکہ اس کا سراپا ہی افلاکی نظر آتا تھا۔ مقابلے میں یوں محسوس ہوا کہ ہم اپنے ایم اے اور فیشن کے باوجود محض

ارضی قسم کی نباتات ہیں، یعنی از قِسم شلغم و کدو۔ پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں دیکھا بھی، لیکن نہ ان گلابی ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی نہ ان شراب آنکھوں نے پیغام دیا۔ مفت میں راہ چلتے چلتے ہمارا صبر و قرار لُٹ گیا۔

جب یوں بیٹھے بٹھائے ہمیں بیماریٔ دِل نے آلیا اور راجو نے ہمارا کام تمام ہوتے دیکھا تو بے چارہ وفا کا مارا سرہانے بیٹھ گیا اور ہمارا دردِ دِل بٹانے لگا لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی اسی مسیحا نفس کی محتاج ہے تو کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور اُسی تگ و دو میں ماسی مہرو تک جا پہنچا۔

ماسی مہرو سارے شہر کی خالہ تھی اور کہا جاتا تھا کہ سارے شہر کا درد اس کے جگر میں ہے۔ گویا ایک معزز شہری ہونے کے اعتبار سے ماسی مہرو کی اسی رگ میں ہمارے درد کا شائبہ بھی تھا۔ راجو نے اپنے زعم میں ماسی کی اسی رگ پر جا ہاتھ رکھا، کیونکہ واپس آیا تو خوشی سے ناچ رہا تھا۔ بولا:

"ماسی سب مشکلیں آسان کر دے گی۔"

راجو ہمارا غم خوار ضرور تھا اور بظاہر خبر بھی اچھی لایا تھا مگر سادہ لوح تھا۔ ہمیں خدشہ ہوا کے ماسی ہماری عاشقانہ بدحالی کا قصّہ سُن کر اسے عام نہ کر دے۔ ہم عشق بھی کرنا

چاہتے تھے اور حجاب میں بھی رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کِسی قدر تشویش کے ساتھ راجو سے پوچھا:

"راجو اس کے سامنے ہمارے عشق سے زیادہ پردہ تو نہیں اٹھایا؟"

"نہیں بادشاہو! میں نے تو آپ کا نام ہی نہیں لیا۔ صرف اتنا پوچھا تھا کہ مائی یہ جو ہندو لڑکی ہے ناموتیا! یہ کیسی لڑکی ہے؟"

ہم نے راجو کے سوال پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس سوال سے ہمارے وقار کو تو کوئی آنچ نہ آسکے گی۔ لیکن موتیا کے ہاں ہمارا نام بھی رجسٹر نہیں ہو گا۔ ہم نے کہا:

"راجو! تمہارا سوال ہے تو ڈپلومیٹک، لیکن اس سوال میں ہم کہاں ہیں؟ ماسی تو یہ سمجھے گی کہ ہماری خاطر نہیں رفاہ عامہ کے لئے پوچھا گیا ہے۔ اور بالفرض وہ جواب لے آئی کہ موتیا ایسی نہیں، ویسی لڑکی ہے تو اس کا ہمیں کیا ثواب ملے گا؟"

راجو نے کچھ سمجھ کر سر ہلایا، گویا کہتا ہو "صفر"

"لہٰذا راجو میاں!" ہم نے کہا۔ "کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ ماسی پر ہمارا حالِ دِل بھی واضح ہو جائے، لیکن زیادہ تہہ تک بھی نہ پہنچ سکے۔"

راجو جھٹ بولا:

”تو موتیاں والیو، پھر بذریعہ ڈاک عشق کرو۔“

راجو ہم سے دِل لگی بھی کر لیتا تھا۔ ہم نے کہا:

”دیکھو راجو! یہ ہنسی کا مقام نہیں۔ جاؤ اور بذریعہ ماسی ہماری خاطر ایک ضمنی سوال پوچھ آؤ۔“

راجو اس دوسری مہم پر جاتے ہوئے بہت خوش نہ تھا لیکن لوٹا تو ہنستے ہنستے کہنے لگا:

”ماسی مہرو کے ساتھ وکیلوں کی سی چال چلی ہے۔“

”مثلاً کیسے؟“

”میں نے کہا: ماسی مہرو دوسری بات یہ ہے کہ خدا جانے ہمارے پروفیسر صاحب ہر وقت موتیا کی تعریف میں شعر کیوں پڑھتے رہتے ہیں۔“

کیا غضب کا سوال پوچھا تھا راجو نے! ہمیں محسوس ہوا کہ اب رازِ محبّت اور عزّتِ سادات دونوں محفوظ ہیں لیکن یہ نہ سوچا کہ ہم اقتصادیات کے ایم اے ہیں، تو ماسی عشقیات کی پی ایچ ڈی ہے۔ وہ تو راجو کی شکل دیکھ کر ہی ہمارے دِل کے بھید پا گئی تھی۔

دوسرے روز ہم گھر کے صحن میں بیٹھے تھے کہ ماسی مہرو دروازے سے داخل ہوئی۔ راجو اتّفاق سے گھر میں موجود نہ تھا۔ اس سے پہلے ہماری نگاہیں ماسی سے چار ضرور ہوئی

تھیں، لیکن ہمکلامی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ماسی کچھ کہنے کو بے تاب تھی لیکن ہم سے براہِ راست بات کرنے سے جھینپ رہی تھی۔ آخر راجو کو نہ پا کر ہم سے پوچھنے لگی:

"راجو گھر میں نہیں؟"

ہم نے سوچا ضرور خوش خبری لائی ہے، لیکن مزید سوچا کہ اگر اس خوشخبری کا اظہار راجو کی موجودگی ہی پر منحصر ہے تو ہماری خوشی باسی ہو جائے گی۔ جی چاہا کہ کاش ماسی کو بتا سکیں کہ اس موضوع پر ہم سے براہِ راست بھی بات ہو سکتی ہے اور یہ کہ اس سے ہماری بے ادبی کا کوئی خدشہ نہیں اور چھوٹی موٹی بے ادبی سرزد ہو بھی گئی تو ہم بخوشی برداشت کر لیں گے، لیکن یہ سب کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ماسی بولی:

"کب تک آئے گا؟"

"کون؟ راجو؟ وہ تو شاید کل تک بھی نہ آئے اس لئے اگر کوئی پیغام ہے تو ہمیں بتا دو ہم راجو کو پہنچا دیں گے۔"

"پیغام تو ہے مگر۔۔۔؟"

"ہاں ہاں کہہ دو ہم راجو کو آتے ہی بتا دیں گے۔"

"نہیں، راجو ہی آپ کو بتائے تو اچھا ہے۔"

”گویاپیام ہمارے نام ہے؟“

”ہے تو سہی۔“

”کس کا ہے؟“

”موتیا کا“

”موتیا؟ کون موتیا؟“

ہم اپنے وقار کو آخری سہارا دے رہے تھے لیکن دانائے راز ماسی کے صبر کا پانہ بھی لبریز ہو گیا۔ بولی:

”وہی موتیا جس کے لئے شعر پڑھتے رہتے ہو۔“

اب وقار کی حفاظت بے کار تھی۔ ہم نے ماسی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا:

”کیا کہتی تھی موتیا، ماسی؟“

”ہاں، اس طرح پوچھونا“

ماسی کی آنکھ اور زبان میں ایک واضح بے باکی آنے لگی۔ ہم نے وہی سوال دہرایا:

”اچھا کیا کہتی تھی؟ بولو بھی ماسی۔“

”ڈھولے گاتی تھی۔“

”کس کے؟“

”تمہارے۔“

”سچ“

”جان دیتی ہے تم پر۔“

ہم خوشی سے بے ہوش ہو گئے اور ٹیکنی کلر میں خواب دیکھنے لگے۔ جاگے تو ماسی جا چکی تھی اور راجو سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ راجو اور ماسی باہم نوٹ ملا چکے ہیں۔ راجو نے ہمیں چھیڑنے کی خاطر غیر جانبدارانہ طور پر گنگنانا شروع کر دیا۔ ”پیا ملن کو جانا۔“ اس پر ہم نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ راجو جو بہر حال نوکر ہے اب ہمارے محبّت کے معاملات میں حصّہ نہ لے گا۔ ہمارا رابطہ براہِ راست ماسی مہرو سے قائم ہو چکا ہے، چنانچہ اس کے بعد ہم نے راجو سے اپنی گفتگو غیر عاشقانہ باتوں تک محدود رکھی۔ مثلاً چائے لاؤ، برتن اٹھالو وغیرہ۔

ہمیں اب ماسی سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرنے کی بے تابی تھی، لیکن ماسی مہرو ہمیں ترسانے کی غرض سے دوسرے روز سہ پہر سے پہلے نہ آئی۔

"ماسی، موتیا اور کیا کہتی تھی؟"

"کہتی تھی: اُتّے خدا وسدا، تلے اک دم ماہیئے[2] دا۔"

"یعنی ہمارا دم؟"

"نہیں کالے چور کا۔"

"نہیں ہمارا۔" ہم نے ماسی کی واضح بے ادبی کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں، تمہارا نہیں تو اور کس کا؟"

یہ سنا تو ہمارے دماغ کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے قمقمے جگمگا اٹھے۔ ہم نے وفورِ اشتیاق میں کہا:

"اس موتیا سے ملاقات کب ہو گی؟"

"ملاقات؟ وہ تو نہیں ہو سکتی۔"

"ہوں؟ کیوں نہیں ہو سکتی؟"

---

[2] اوپر خدا بستا ہے اور نیچے صرف میرے محبوب کی ذات

"وہ ایسا ہی کہتی تھی۔ کہتی تھی پتہ چل گیا تو گھر والے مار ڈالیں گے۔"

"ماسی، وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں مل سکتی؟ میں صرف اسے قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"قریب سے دیکھنے ہی کو ملاقات کہتے ہیں۔ وہ نہیں ہو سکتی۔"

"ماسی، ایک دفعہ اسے کہہ کر تو دیکھو۔"

"کیا کہہ کر دیکھوں؟"

"یہی کہ میری بات سُن جائے۔ میں اسے صرف دو لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ دو نہیں، ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین چار پانچ بس پانچ لفظ۔۔۔" میں نے فقرے کے الفاظ دِل میں گنتے ہوئے کہا۔

"پھر؟"

"پھر وہ بے شک نہ ملے۔"

"اچھا دیکھوں گی۔"

"ماسی اتنے لمبے مستقبل کا صیغہ مت استعمال کرو۔ جو کچھ دیکھنا ہے ابھی دیکھو، آج ہی دیکھو اور ہمیں آکر بتاؤ۔"

ماسی چل دی۔

ایک دن گزر گیا۔ ایک دن اور گزر گیا، لیکن ماسی نظر نہ آئی۔ بھئی تم بھی جوان ہو۔ اگر کبھی عشق کیا ہے تو ہماری بے تابیٔ دِل، ہمارے اندیشہ ہائے دور و دراز، ہمارے وسوسوں اور ہمارے بیم ورجا کا تمہیں کچھ اندازہ ہو گا۔ عشق کی اس منزل میں بھوک اور نیند حرام ہو جاتی ہے اور جنگل کی طرف نکل جانے کو جی چاہتا ہے۔ ہم نے جنگل کا رُخ تو نہ کیا، لیکن وہ تمام علاماتِ عشق، جو حکماء کے نزدیک گھر کے اندر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ ہم میں ظاہر ہونے لگیں۔

تیسرے روز غروبِ آفتاب کے وقت ہم غمِ محبّت کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے کہ اچانک دستک کے بغیر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ بتاؤ تو بھلا کون تھا؟

"ماسی مہرو" نیاز جھٹ بول اٹھا۔

"اوں ہوں۔" چچا نے سر ہلایا۔

"راجو؟" میں نے بتانے سے زیادہ پوچھا۔

"ارے بھئی، ماسی اور راجو کا گھر میں آنا بھی کوئی آنا تھا؟" چچا کسی قدر جوش سے بولے۔ یہ خود موتیا تھی! ہاں موتیا! اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ ہمارے گھر میں موتیا! یہ وہ خُدا کی قدرت تھی جس کے متعلق غالب نے شاعری تو کی ہے لیکن غالباً کبھی دیکھی نہ تھی۔ ہم نے سچ مچ دیکھی اور دیکھتے ہی ہمارے دِل کے تار سے نغمہ پھوٹا:

یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

لیکن جب موتیا کے چہرے کو غور سے دیکھا تو ہمارا نغمہ اللہ اکبر پر ہی رک گیا۔ موتیا کے چہرے پر ہراس تھا۔ اسے کوئی بے پناہ کشش کھینچ تو لائی تھی، لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی جیسے اسے کسی غلطی کا احساس ہوا ہو، جیسے اس کی حیا کی حس بیدار ہو گئی ہو۔ اس کے منہ سے صرف تین الفاظ تھے جنہیں وہ غالباً سارے راہ زیرِ لب دہراتی آئی تھی؟

"کیا حکم ہے؟"

یہ ہمارے بلاوے کا جواب تھا اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا، بولی!

"اب میں جاتی ہوں۔"

اور دروازہ کھول کر ہوا ہو گئی۔ صحبتِ یار چشم زدن سے بھی کم تر وقت میں آخر ہو گئی تھی۔

باہر نکل کر دیکھا، تو موتیا کے پیچھے کوئی آدمی جا رہا تھا۔ کیا اس آدمی نے موتیا کو نکلتے دیکھ لیا تھا؟ کیا وہ اس کے گھر والوں کو تو نہ بتائے گا؟ کیا وہ بے چاری کو ایذا دیں گے؟ میرے دِل میں ہزار شکوک اُبھرے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے دوست اکرم آئے اور بولے:

"سنا ہے تمہارے گھر موتیا آئی تھی۔ ہندو مشتعل ہو رہے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ فکر مت کرو۔ مولوی عبد الغفور جانبازوں کی ایک جماعت لے کر تمہاری حفاظت کو آ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کافروں کی کیا جرأت کہ ہمارے غازی کو چھیڑیں۔"

یہ سنا، تو میرا سر چکرا گیا، مجھے ہندوؤں کے اشتعال کی واجی سی فکر ضرور تھی لیکن اس خیال سے کانپ اٹھا کہ جملہ جانبازانِ شہر اپنے "غازی" کی حفاظت کو بڑھ رہے ہیں۔ ہماری رسوائی کا اس سے زیادہ عظیم الشان اہتمام اور کیا ہو سکتا تھا؟ ایک خیال ہمارے ذہن میں رہ رہ کر اُبھرنے لگا: اپنے بزرگوں کی عزّت کا خیال! وہ سنیں گئے تو کیا کہیں گے! پھر اپنے شریکوں کی چہ میگوئیوں کا خیال! وہ سُنیں گے تو کیا کیا نہ کہیں گے! بے

شک عشق کرنا عیب نہیں، لیکن عشق میں اناڑی پن بڑی نالائقی ہے اور یہ نالائقی ہم سے ہو گئی تھی۔

نظیری کا مصرعہ بار بار کانوں میں گونجتا:

ناموسِ صد قبیلہ زیک خامئ تو رفت

اور باہر گلی میں چند لونڈوں نے نعرہ بلند کیا:

"ہمارا غازی۔۔۔زندہ باد"

یہ مولوی عبد الغفور کے جیش کا نابالغ ہراول تھا۔ میں نے اکرم سے کہا!

"اکرم جاؤ۔ مولوی صاحب کو روکو اور انہیں کہہ دو کہ موتیا کی کہانی کسی دشمن کی ہرزہ سرائی ہے اور افواہوں پر کان دھرنا شرعاً بھی روا نہیں۔ اور ہاں یہ بھی پتہ کر لانا کہ موتیا کس حال میں ہے؟"

اکرم بولا۔

"اگر موتیا کی کہانی محض افواہ ہے تو اس کا حال پوچھنے کی بے تابی کیوں؟"

"بھئی، سمجھے کیوں نہیں؟ افواہ تمہارے لئے نہیں مولوی صاحب کے لئے ہے۔ انہیں روکو اور موتیا کی خبر لاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد اکرم، مولوی صاحب کی کامیاب ناکہ بندی کرنے کے بعد لوٹے اور بمشکل یہ مبارک خبر سنا ہی چکے تھے کہ ملک گھسیٹا خان تشریف لے آئے اور ابتدا ایک پُرجوش مبارک باد سے کی۔ مبارک باد کی شانِ نزول پوچھی تو بولے:

"تم نے مسلمانوں کی عزّت رکھ لی۔"

شانِ نزول فوراً سمجھ میں آ گئی۔ ملک صاحب کے گنوار پن کی تہہ بہت دبیز تھی، لہٰذا عافیت اسی میں تھی کہ ان کے ساتھ بحث کی بجائے اتّفاق کر لیا جائے۔ سو عرض کیا:

"ملک صاحب یہ خاکسار کس قابل ہے بس تمنّا تھی کہ کوئی خدمتِ اسلام کر جاؤں، سو کر دی۔"

"شاباش! اس کا اجر تمہیں خدا دے گا۔"

"کاش، یہ سعادت میری جگہ آپ کے حصّے میں آئی ہوتی۔"

"تم دعا کرو۔" اور یہ کہتے ہوئے مجھے ایک رازدارانہ آنکھ ماری۔

میں ملک صاحب کو دیکھتا اور سوچا کہ کیا انسانی دماغ احساساتِ لطیف سے اس قدر عاری بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن کتنے آدمی ہیں جو اس کمی کو محسوس کرتے ہیں؟ کسی کو جسمانی خراش آ جائے تو ہماری تعزیرات میں اسے ضربِ شدید کہتے ہیں لیکن ذہنی چوٹ کا تعزیررات میں کہیں ذکر ہی نہیں، حالانکہ سنگین ترین جرم وہ بدنی زخم نہیں جو تیز دھار آلے سے آتا ہے، بلکہ وہ ذہنی گھاؤ ہے جو کند زبان سے واقع ہوتا ہے۔

آخر مبارک باد کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ملک صاحب رخصت ہونے لگے تو میں نے گہرا سانس لیا اور پیشتر اس کے کہ اخوّت کا مارا کوئی اور قدر دان مبارک باد کا بوجھ ہلکا کرتا میں نے دروازہ بند کر کے بتّی گُل کر دی اور بستر پر دراز ہو گیا، لیکن نیند کہاں؟ وہی دِل جو چند ساعت پہلے گزر گاہِ خیال سے وساغر تھا، اب گوناگوں وسوسوں کی آماجگاہ تھا۔ کہیں وہ ظالم اس بے چاری کو ستانہ رہے ہوں، لیکن آخر اس کا جرم ہی کیا ہے؟ اس نے فقط ایک لمحے کے لئے میرے کمرے میں جھانک کر دو لفظ ہی تو کہے تھے اور اگلے لمحے میں غائب ہو گئی تھی۔ کیا کسی سے بات کرنا جرم ہے؟ کیا وہ محتسب کسی سے بات نہیں کرتے؟ نہیں، وہ موتیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔

دوسرے دن کالج میں چھٹی تھی۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ موتیا کے باپ کو اشتعال ضرور آیا تھا، لیکن اس نے خاموشی سے فقط پرنسپل سے جا کر شکایت کی اور میرے تبادلے کا مطالبہ کیا۔

کوئی دوپہر کا وقت تھا کہ چپڑاسی پرنسپل صاحب کا سلام لے کر آیا۔ پرنسپل صاحب میرے قریب ہی رہتے تھے۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ معمول سے زیادہ مسکرا کر ملے اور ابتدائی علیک سلیک کے بعد ہماری گفتگو شروع ہوئی۔

"لالہ لوڑیندامل کہتے ہیں کہ کل اُن کی لڑکی تمہارے مکان پر گئی تھی۔"

"جی ہاں ٹھیک کہتے ہیں۔"

"کیسی لڑکی ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"خوبصورت ہے؟"

"جی ہاں۔ بہت!"

"کس لیے گئی تھی؟"

"ایک بات سننے کے لئے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے بُلا بھیجا تھا۔"

”کیابات کرنا تھی؟“

”مجھے تم سے محبّت ہے۔“

”پھر کہہ دی؟“

”کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ آئی اور چل دی۔“

”اسے بھی تم سے محبّت ہے؟“

”آثار تو ایسے ہی ہیں۔“

”شادی کرلو گے۔“

”دِل و جان سے۔“

”مگر تم مسلمان ہو۔“

”جہانگیر بھی مسلمان تھا۔“

”مگر وہ بادشاہ بھی تھا۔“

”یہ معمولی سی کمی ضرور ہے۔“

پرنسپل صاحب ہنس دیے اور بولے:

”یہ کمی تو شاید مستقبل قریب میں پوری نہ ہو سکے۔ خیر چائے تو پیو۔“

پرنسپل صاحب پر ولایت کی تعلیم نے نہائت صحت مند اثر کیا تھا۔ چائے پینے کے دوران کہنے لگے:

”لالہ جی تمہارے تبادلے پر مُصر ہیں، لیکن مجھے یہ نہیں بتا سکے تمہارا قصور کیا ہے۔ کل کسی نیک بخت نے میرے صحن میں جھانک لیا تو میرے تبادلے کا تقاضا ہونے لگے گا اور اگر اس پھرتی سے تبادلے شروع ہو گئے تو گورنمنٹ کے کالج چلنے سے رہے۔ میں لالہ جی کو سمجھا دوں گا۔“

پرنسپل صاحب کی ملاقات تو حسبِ معمول خوشگوار تھی، لیکن ہمارا دِل ہمارے رومان کی طرح نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ اب گلی جس سے موتیا گل کترتی گزرتی تھی، سونی پڑی تھی۔ موتیا کو سلام بھیجنے کی حسرت تھی، لیکن اب پیام بری کون کرتا؟ ماسی روپوش ہو چکی تھی اور راجو کی وہاں تک رسائی نہ تھی۔

تیسرا دن تھا۔ پچھلے پہر صحن میں بیٹھا تھا کہ دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار سی خاتون داخل ہوئی۔ قریب آئی تو میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ خاتون کسی تمہید کے بغیر بولی:

”بیٹا، مجھے پہچانتے ہو؟“

”نہیں۔“میں نے کسی قدر معذرت کے لہجے میں کہا۔

”میں موتیا کی ماں ہوں۔“

ایک لمحے کے لئے میرا دماغ جواب دے گیا۔ ذرا سنبھلا تو کرسی پیش کی، لیکن اس نے کرسی کو توجّہ نہ دی۔ میرے منہ سے نکلا:

”موتیا تو خیریت سے ہے؟“

”موتیا کی خیریت کی بہت فکر ہے؟“

”مجھے ڈر تھا آپ اسے ایذا نہ پہنچائیں۔“

”ہم اور موتیا کو ایذا؟ موتیا ہماری بیٹی ہے۔“

”شکر ہے۔“

”لیکن کچھ اس ایذا کا بھی خیال ہے جو موتیا کے ماں باپ کو پہنچی ہے؟“

اس فقرے پر میں چونکا تو موتیا کی ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اگلے لمحے میں اس کی پلکیں آنسو نہ تھام سکیں اور ایک گریئے کے عالم میں اس کے منہ سے نکلا۔

”اے کاش! میری بیٹی تو یہاں نہ آئی ہوتی۔“

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ میری زبان گنگ تھی۔ مجھے اس وقت تک اگر کسی کی رسوائی کا خوف تھا تو وہ اپنی اور اپنے خاندان کی رسوائی تھی۔ موتیا اور اس کے ماں باپ کی بدنامی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اب میرے کانوں میں نظیری کا پورا قطعہ گونجنے لگا جو مجھ سے زیادہ موتیا پر صادق آتا تھا۔

رفتی بہ بزمِ غیر، تونکونامی تو رفت

ناموس صد قبیلہ بہ یک خامی تو رفت

اکنون اگر فرشتے نکو گویدت چہ سود

در شہر، حکایتِ بدنامی تو رفت

میں اسی سوچ میں تھا کہ موتیا کی ماں چل کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے میری طرف دیکھا اور ایک کرب انگیز لہجے میں کہا:

"ہر گھر میں موتیا کا چرچا ہے اور جب تک تم یہاں موجود ہو، رہے گا۔"

میں نے پیچھے چلتے ہوئے کہا:

"آپ اطمینان رکھیں۔ میں کل شام سے پہلے یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

موتیا کی ماں کا چہرہ کھل اُٹھا۔ دروازے سے نکلنے لگی تو ممنونیت میں اس کے منہ سے دعا نکلی:

"جیتے رہو! بھگوان تمہارا بھلا کرے۔"

کوئی گھنٹہ بھر بعد میرے دوست اکرم آئے اور آتے ہی بولے:

"سنا ہے تمہارے گھر موتیا کی ماں آئی تھی اور تم نے ہندوؤں سے صلح کرلی ہے۔"

"پھر؟"

"مولوی عبدالغفور بڑے مشتعل ہو رہے ہیں۔ تمہارے خلاف فتویٰ دینے والے ہیں۔"

"میرا قصور؟"

"مولوی صاحب کے پاس چشم دید شہادت پہنچی ہے کہ موتیا کی ماں کو تمہارے گھر کے دروازے پر دیکھا گیا اور تمہیں دعا دیتے سنا گیا۔"

"دعا لینا کب سے گناہ ٹھہرا ہے؟"

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ باہر دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے چند لونڈے یک زبان ہو کر بولے۔

"ہمارا غدّار۔۔۔ مردہ باد!"

دوسرے روز ہم بالا پور سے اپنی درخواست پر تبدیل ہو کر ایک دوسرے شہر میں پہنچ گئے اور فتوے کی زد سے نکل گئے۔ وہاں دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ہمارے نام ایک اجنبی سا خط آیا۔ کھول کر دیکھا تو فقط اتنا لکھا "پردیسی نال نہ لائیے یاری، توڑی لکھ سونے دا ہووے[۳]!"

یہ موتیا کا خط تھا۔ جہاں فتویٰ نہ پہنچ سکا تھا، عشق پہنچ گیا۔ موتیا کی محبّت کو بظاہر خاندان کی بدنامی کا احساس نہ تھا۔ میرے پہلو میں بھی دِل تھا۔ بے اختیار بھر آیا۔ چاہا کہ جواب میں اس شعر کا دوسرا مصرع لکھ بھیجوں اور کلیجہ چیر کر کاغذ پر رکھ دوں:

"پر اک گلوں پردیسی چنگا، جد یاد کرے تاں رووے![۴]"

لیکن قلم اٹھایا، تو ایک بے بس ماں کی روتی آنکھیں سامنے آ گئیں اور قلم رکھ دیا۔

---

[۳] پردیسی خواہ لاکھ سونے کا ہو اس سے محبت مت کر۔

[۴] لیکن ایک طرح پردیسی ہی اچھا ہے کہ پیار کرتا ہے تو رو دیتا ہے۔

ہم تینوں نے دیکھا تو چچا کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ کہانی ختم ہو چکی تھی۔ ہم خاموشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

# قدرِ ایاز

کرنیلوں کو رہائش کے لئے اکثر خاصے عمدہ سی کلاس بنگلے ملتے ہیں۔ مجھے خوش قسمتی سے ایک ایسا بنگلہ مل گیا جو اپنی کلاس میں بھی انتخاب تھا، یعنی مجھے کرنیلوں میں وہ امتیاز حاصل نہ تھا جو میرے بنگلے کو بنگلوں میں تھا۔ بوڑھے بیروں سے روایت تھی کہ ولسن روڈ کا یہ لاشریک بنگلہ ولسن صاحب نے خاص طور پر اپنے لئے بنوایا تھا۔ لیکن موصوف نے اس کی تعمیر میں چھاؤنی کے کچھ دوسرے بنگلوں کا خون بھی شامل کر دیا تھا۔۔ کئی انگریزوں کی انگریزی ہمارے ملک میں رہ کر کمزور ہو گئی تھی۔

یہ بنگلہ کم و بیش دو ایکڑ قطعہ زمین میں واقع تھا، یعنی قسّامِ ازل نے ہی اسے خاصا شاہانہ طول و عرض بخشا تھا۔ عمارت کے سامنے وسیع چمن تھا جس کے حاشیے پر مہندی کی گہری سبز باڑ کے سر پر، نیزوں اونچے سرو اور سفیدے کے پیڑ لہلہاتے تھے۔ چمن میں جا بجا سرخ و سپید گلاب کے پودے تھے جن کے پھولوں میں گمنام مالیوں اور میموں کی پرورش اور پیار کا رنگ جھلکتا تھا۔ بنگلے کے دونوں پہلو گلزار تھے اور پائیں باغ تو ایک نہایت ہی دِلربا سی سیر گاہ تھی جس کی وسعت میں ہمارے فرنگی پیش رو اپنی میموں کی

کمر میں بازو ڈالے گل گشت کیا کرتے تھے۔ عمارت کے اندر بیٹھنے، کھانے اور مطالعہ کے کمروں کے علاوہ چار سونے کے کمرے تھے اور ہر خواب گاہ کے ساتھ احتراماً ایک ڈریسنگ روم اور غسل خانہ بھی ملحق کر دیا گیا تھا اگرچہ ان چھوٹے کمروں کا ایک اپنا اندازِ تکبّر بھی تھا کہ ان میں دوسری اشیا کے علاوہ قدِّ آدم آئینے اور بجلی کے سرکاری حمام بھی لگے ہوئے تھے جو ہر غسل خانے کا نصیب نہیں۔

الغرض ہمارے بنگلے کا مزاج ہر زاویئے سے امیرانہ تھا۔ مقابلے میں ہمارے اثاثے کے تیور ہر چند کہ خاکسارانہ تھے تاہم اپنے مکان کی شان کے پیشِ نظر ہم نے جوں توں کرکے ہر کمرے کے لئے ایک قالین یا دری پیدا کر لی۔ اگرچہ اس کارِ خیر کا بیشتر اجر مقامی کباڑیئے کو ملا۔ علاوہ ازیں مناسب فرنیچر بھی حاصل کر لیا۔ کچھ اپنا کچھ ایم ای ایس کا۔ کھانے کے کمرے میں کرائے کا کا ریفریجریٹر بھی رکھ دیا جو خریدتے ہوئے ریفریجریٹروں سے کسی طرح مختلف نہ تھا سوائے اس کے کہ ضعفِ پیری سے اس کا زوق برودت کسی قدر سست ہو گیا تھا اور شاید اسی لئے حدی کو ذرا تیز لَے میں پڑھتا تھا۔ بہر حال یہ ہمارا اور ریفریجریٹر کا اندرونی معاملہ تھا۔ ہمارے گول کمرے میں لفٹیننی کے زمانے کا ریڈیو تو تھا ہی۔۔۔ جو نئے ریشمی غلاف میں خاصا کم عمر نظر آتا تھا۔۔۔ شہر میں ٹیلیوژن آیا تو ہم ایک ٹیلیوژن سیٹ بھی لے آئے جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ قسطوں پر خریدا گیا ہے۔ الغرض ہمیں نہیں تو ہمارے ملنے والوں کو ہماری فارغ البالی کا رشک آور احساس ہوتا تھا۔ بلکہ ہمارے اپنے بچّوں نے بھی اس مصنوعی فارغ البالی کی

مرصع جالی کے پیچھے کبھی نہ جھانکا تھا اور جالی کے فرنٹ ویو پر ناز کرنے میں حق بجانب تھے اور کرتے تھے۔

سلیم میاں جو ابھی ابھی میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے۔ دوسرے کرنل زادوں کی طرح اور ان کے ہمراہ بے فکری سے بیڈ منٹن کھیلنے اور سرِ شام ہی دوستوں کے ساتھ ٹیلیوژن کے سامنے جم جاتے۔ کیا مجال جو کوئی غیر اس مشاہدے میں مخل یا شریک ہو سوائے اس کے کہ ہمارا بوڑھا ملازم علی بخش ان کی تواضع کے لئے کمرے میں خاموشی سے داخل اور خارج ہوتا رہتا۔ علی بخش کو یوں بھی سلیم سے اُنس تھا کہ اسی کے ہاتھوں میں پلا تھا۔

ایک دن میں اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ علی بخش خلافِ معمول رونی صورت بنائے داخل ہوا۔ وجہِ گرانی پوچھی تو کہنے لگا:

"سلیم میاں نے ڈانٹا ہے۔ کہتے ہیں بد تمیز ہو، گنوار ہو، دیہاتی ہو۔"

میں نے ان ارشادات کی شانِ نزول پوچھی تو بولا:

"کل سلیم میاں کی غیر حاضری میں ان کے ایک دوست امجد صاحب آئے اور باہر برآمدے ہی میں آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے کہنے پر انہیں ٹھنڈے پانی کا گلاس پیش کیا۔ کافی دیر سلیم صاحب کا انتظار کرتے رہے لیکن آخر مایوس ہو کر چل

دیے۔ بعد میں سلیم صاحب کو بتایا تو مجھ پر برس پڑے۔ کہنے لگے انہیں گول کمرے میں سوفے پر کیوں نہ بٹھایا؟ ریفریجریٹر سے نکال کر کوکا کولا کیوں نہ پیش کیا؟ اب امجد سمجھے گا کہ ان لوگوں کو تواضع کا سلیقہ نہیں، دیہاتی ہیں، جنگلی ہیں۔ اور پھر جو منہ میں آیا کہہ دیا۔"

علی بخش کی داستانِ غم ختم ہوئی تو سلیم میاں بھی آ گئے۔ علی بخش کے چہرے پر شکایت لکھی ہوئی دیکھی تو اپنے دِل پر لکھی ہوئی شکایت بیان کرنے لگے۔ ہم نے سکون سے یہ قصّہ بھی سُنا۔ طرفین کے بیانوں سے واضح تھا کہ تنازعہ بہت خفیف ہے اور یہ کہ دو طرفہ طوفان کا حدودِ اربعہ ایک چائے کی پیالی میں سما سکتا ہے۔ علی بخش اس لئے ناخوش تھا کہ اسے دیہاتی کہا گیا تھا اور سلیم میاں اس بات پر برہم تھے کہ علی بخش کی غلطی کی وجہ سے امجد نے انہیں دیہاتی سمجھا ہو گا۔ ہمارے نزدیک دیہاتی ہونا یا سمجھا جانا ایسی ناقابلِ برداشت قباحت نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے ہنسی ہنسی میں دیہاتی پن کے فضائل بیان کرنا شروع کئے اور اس بلاغت کے ساتھ کہ سلیم اور علی بخش دونوں مسکرا دئے اور باہم راضی ہو گئے۔ باتوں باتوں میں ہم انہیں ایک دیہاتی کا قصّہ سنانے لگے:

ایک تھا لڑکا جو اپنے گاؤں سے پرائمری پاس کرنے کے بعد ایک شہر کے ہائی سکول میں جا داخل ہوا۔ اپنے گاؤں میں تو وہ چھوٹا موٹا چوہدری یا چوہدری کا بیٹا تھا۔ لیکن تھا ٹھیٹھ دیہاتی۔ پہلے دن کلاس میں گیا تو ننگے سر پر صافہ باندھ رکھا تھا۔ بدن پر کُرتا اور تہمد اور

پاؤں میں پوٹھوہاری جوتا۔ ماسٹر جی نے شلوار پہننے کو کہا تو دھیمی آواز میں بولا: "او خدایا۔ ستھن تے کڑیاں پاوندیاں نے[۵]۔"

سلیم میاں یہ سُن کر کھکھلا اُٹھے اور بولے:

"سچ مچ پکا پنیڈو تھا۔۔ مگر ابّا جان! وہ پتلون کیوں نہیں پہنتا تھا؟"

میں نے کہا: "بیٹا! یہ آج سے چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں اگر ماسٹر جی خود بھی پتلون پہن لیتے تو شہر کے کتّے انہیں ولایت پہنچا آتے۔"

سلیم میری بات پوری طرح سمجھے بغیر ہنس دیئے۔ بوڑھا علی بخش پوری طرح سمجھ کر مسکرایا۔ ہم نے کہانی جاری رکھی۔

ان دنوں پتلون پوش خال خال ہی نظر آتے تھے۔ مثلاً سارے اسکول میں ایک سیکنڈ ماسٹر صاحب تھے جو سوٹ پہنتے تھے۔ لڑکے انہیں جنٹل مین کہا کرتے تھے۔ لاہور میں تعلیم پائی تھی۔ وہیں کے رہنے والے تھے۔ ہر فقرے میں دو تین لفظ انگریزی کے بولتے تھے اور لڑکے رشک سے مرنے لگتے تھے۔ آدمی خوش مزاج تھے۔ ہاکی کے کھلاڑی تھے اور شکار کے شوقین ایک دفعہ دسمبر میں شکار کرتے کرتے اسی دیہاتی

---

۵ چکوال میں شلوار کو ستھن بھی کہا جاتا ہے۔ ترجمہ: "او خدایا، شلوار تو لڑکیاں پہنتی ہیں"۔

لڑکے کے گاؤں جا نکلے۔ رات ہو رہی تھی۔ آپ نے اسی کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے دراوزے پر جا دستک دی۔ لڑکے نے اچانک ماسٹر جی کو گھر کے دراوزے پر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے چکرا سا گیا۔ ماسٹر جی نے کئی دفعہ مذاق میں کہا تو تھا کہ ہم ایک دن چھوٹے چوہدری کے مہمان بنیں گے۔۔۔ ماسٹر جی اسے چھوٹا چوہدری بھی مزاقاً ہی کہتے تھے لیکن چوہدری کو توقع تھی کہ ماسٹر جی مذاق کو مذاق کی حد تک ہی رکھیں گے۔ مگر آج وہ حد پھلانگ کر اس کے روبرو آ کھڑے ہوئے تو چھوٹے چوہدری کو میزبانی کے بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ نہیں کہ چھوٹا چوہدری یا اس کے گھر والے مہمان نواز نہ تھے۔ انہیں صرف اس بات کا یقین نہیں تھا کہ ان کی مہمان نوازی ماسٹر جی کو موافق بھی آئے گی یا نہیں۔ بہر حال انہوں نے اپنی تواضع کی ابتدا کی۔ چھوٹا چوہدری اور اس کے بڑے بھائی ماسٹر جی کو بصد تعظیم اپنی چوپال میں لے گئے۔ چوپال کے دو حصّے تھے۔ ایک میں گھوڑی بندھی تھی اور دوسرے کے عین مرکز میں آتش دان تھا جس کی آگ کے شعلے اور دھواں بیک وقت بلند ہو کر چوپال میں روشنی اور تاریکی پھیلا رہے تھے۔ آتش دان کے اردگرد خشک گھاس کا نرم اور گرم فرش تھا جسے مقامی بولی میں ''ستھر'' کہتے تھے۔ گاؤں کے بیس بائیس آدمی ستھر پر بیٹھے حقّہ پی رہے تھے۔ماسٹر جی داخل ہوئے تو سب کھڑے ہو گئے۔ ماسٹر جی کو ''آؤ جی خیر نال'' کہا۔ ہر ایک نے ان سے مصافحہ کیا۔ ہر ایک نے ان کے بال بچّوں کی خیریت پوچھی۔ماسٹر جی نے چھوٹتے ہی ذرا شرما کر کہہ تو

دیا کہ ابھی بال بچّوں کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن ان نامولود برخورداروں کی خیریت بہرحال ہر ملاقاتی نے پوچھی کہ یہی ان کی تواضع کی ترکیب تھی۔ چونکہ ماسٹر جی نے پتلون پہن رکھی تھی لہٰذا فرش پر بٹھانے کی بجائے ان کے لئے رنگیلی چارپائی بچھا دی گئی۔

سلیم حیران ہو کر بولے: "ابا جان! ان میں اتنی عقل نہ تھی کہ انہیں کرسی دیتے؟"

میں نے کہا: "بیٹا! عقل تو تھی۔ کرسی نہ تھی۔"

سلیم نے فیصلہ کُن انداز میں کہا: "اگر کرسی نہ تھی تو چوہدری کس بات کے تھے؟"

میں نے کہا: "ایک تو وہ چوہدری ذرا چھوٹی قسم کے تھے اور دوسرے گاؤں میں چوہدری پن کی نمائش کرسیوں سے نہیں کی جاتی۔"

سلیم دیہاتیوں کی کوئی غلطی، کوئی کمزوری، پکڑنے پر تُلا ہوا تھا۔ بولا:

"مگر کوئی گول کمرے میں گھوڑی بھی باندھتا ہے؟"

میں نے سلیم کو سمجھایا:

"اگر گھوڑی کے لئے کوئی علیحدہ مستطیل کمرہ نہ ہو تو پھر وہ بھی گول کمرے ہی میں رہتی ہے۔ علاوہ ازیں گاؤں کے کمرے اتنے گول بھی نہیں ہوتے!"

سلیم طنز کو پا گیا اور بولا:

"گول کمرہ تو ویسے نام پڑ گیا ہے۔ ہمارا اپنا گول کمرہ بھی تو چوکور ہے مگر بات یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں گھوڑے گدھے کا کیا کام؟"

میں نے ہنس کر کہا:

"بیٹا! دیہاتی لوگ اتنے مہذّب نہیں ہوتے کہ ڈرائنگ روم میں کتّے لے آئیں، وہ گھوڑوں ہی سے گزارا کر لیتے ہیں۔"

علی بخش مسکرایا۔ سلیم کسی قدر جھینپ گیا لیکن کہانی بہر حال اشتیاق سے سُن رہا تھا۔ بولا:

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر گاؤں کا نائی ماسٹر جی کے پاؤں دابنے لگا۔ ایک نوکر کو دوڑایا گیا کہ ان کے لئے تازہ مکی کے بھٹّے بھُنوا کر لے آئے۔"

سلیم جھٹ بول اٹھے: "ابا جان! مکئی کے بھٹّے تو پک نک پر کھائے جاتے ہیں۔ گھر میں تو چائے پلائی جاتی ہے۔ وہ لوگ اتنی بات بھی نہ جانتے تھے؟"

میں نے کہا: "یہ گھر میں پک نک منا لینے کی غلطی دیہاتیوں سے اکثر ہو جاتی ہے۔ بہر حال ماسٹر جی نے خود ان کی اصلاح کر دی اور بھٹّے کا نام سن کر کہنے لگے:"

"یہ تکلیف نہ کریں۔ ہو سکے تو ایک پیالی چائے پلا دیں۔ ذرا سردی بھی ہے۔"

سلیم نے فوری تائید کی۔ "بات بھی ٹھیک تھی۔ وقت جو چائے کا تھا۔"

میں نے کہا: "بات تو ٹھیک تھی، بشرطیکہ ان کے گھر چائے بھی ہوتی۔"

اس مقام پر سلیم میاں تیزی سے سوال کرنے لگے اور ہماری کہانی نے مکالمے کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ فوراً بولے:

"تو کیا ان کے گھر میں چائے ختم ہو گئی تھی؟"

"نہیں بیٹا! کبھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں چائے ابھی دیہات میں نہیں پہنچی تھی۔"

"تو کیا انہوں نے مہمان سے صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس چائے نہیں؟ کتنی شرم کی بات ہے!"

میں نے کہا "بھئی میرے خیال میں پہلے تو گھر میں چائے کا نہ ہونا شرم کی بات نہیں۔ دوسرے انہوں نے مہمان کی خاطر چائے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی اور آخر مقامی حکیم کے گھر سے چائے مل بھی گئی۔ ان دنوں چائے صرف مریضوں کو پلائی جاتی تھی۔"

سلیم نے لمبا سانس لیا اور بولے: ”چلو شکر ہے چائے تو ملی۔“

میں نے کہا: ”ہاں چائے تو مل گئی، لیکن پھر ایک عجیب سوال پیدا ہو گیا۔“

”یہی نا کہ چائے کے ساتھ کھانے کو کیا دیا جائے؟ وہاں تو لے دے کے مکئی کے بھٹّے ہی تھے!“

”نہیں بیٹے۔ یہ بات نہ تھی۔ سوال ذرا بنیادی نوعیت کا تھا اور وہ یہ کہ چائے بنائی کیسے جائے!“

سلیم نیم وحشت کے عالم میں میرا منہ تکنے لگا اور بولا: ”ابّا جان! چائے تو ہمارا جمعدار بھی بنا سکتا ہے اور دن بھر پیتا رہتا ہے۔ کیا وہ اتنے ہی اناڑی تھے؟“

میں نے کہا: ”بھئی وہاں چائے پینے پلانے کا ہنر پہنچا ہی نہ تھا۔ وہاں لسّی کا رواج تھا اور اس ہنر میں وہ یکتا تھے۔“

”تو کیا ماسٹری کو آخر لسّی پلا دی؟“

”نہیں پلائی تو چائے ہی تھی، لیکن وہ ایسی کامیاب چائے نہ تھی۔“

”یعنی چائے کی لسّی بنا دی؟“

”ہاں بیٹا کچھ ایسا ہی ذائقہ ہو گا۔ چھوٹے چوہدری کا کہنا ہے کہ ماسٹر جی نے ایک گھونٹ پیا، ٹھنڈا لگا اور پیالی رکھ دی۔“

”تو چوہدری شرم سے غرق نہ ہو گیا؟“

”نہیں ایسا حادثہ تو نہ ہوا البتّہ چوہدری کو اس بات کا رنج بہت ہوا کہ ماسٹر جی کی فرمائش پوری نہ کی جا سکی۔ بہر حال انہوں نے کچھ تلافی رات کے کھانے پر مرغ کے سالن سے کر دی۔“

سلیم نے کسی قدر شرارت کہا۔ ”ابّا جان! سالن کھانے کے بعد ماسٹر جی کی صحت پر کوئی فوری اثر تو نہ پڑا؟“

میں نے کہا: ”ہاں۔ بڑا صحت افزا اثر پڑا۔ ماسٹر جی نے پیٹ بھر کر کھایا اور ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔“

”پھر۔“

”پھر ماسٹر جی کے لئے بستر لگایا گیا۔ چوہدری نے ان کے لئے اکلوتی ریشمی رضائی نکلوائی اور وہ سفید جھالر والا تکیہ بھی جس کے غلاف پر بارہ سنگھے کی تصویر کڑھی ہوئی تھی۔ بے شک تکیے میں لچک کی نسبت اکڑ زیادہ تھی اور ماسٹر جی کو اسے سر کے نیچے فٹ کرنے میں کچھ وقت بھی پیش آئی لیکن آخر آرام سے سو گئے۔ صرف ایک مرتبہ

آدھی رات کے قریب گھوڑی کے کھانسے سے ذرا انگریزی میں بڑبڑا کر جاگ اٹھے لیکن برابر ہی چوہدری اور اس کا نوکر سو رہے تھے۔ انہوں نے گھوڑی کو چارہ اور ماسٹر جی کو دلاسا دیا اور پھر صبح تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہ ہوا۔"

"ابّا جان! صبح ہوتے ہی ماسٹر جی تو بھاگ نکلے ہوں گے؟"

"نہیں تو وہ اطمینان سے جاگے۔ پہلے انہیں ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرائی گئی۔ پھر انہوں نے غسل کیا۔"

"غسل بھی بیٹھک ہی میں کیا ہو گا؟"

"بیٹا۔ بیٹھک میں نہیں مسجد میں۔"

"مسجد میں؟" سلیم نے حیرت سے کہا۔ "خانۂ خدا کو غسل خانہ بنا دیا؟"

میں نے کہا: "بھئی گاؤں کے اکثر لوگ مسجد کے غسل خانوں ہی میں نہاتے ہیں، اور بظاہر اللہ تعالیٰ کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔ دیہاتی گھروں میں ہر کام کے لئے علیحدہ خانے کم ہی ہوتے ہیں۔"

سلیم کان پر ہاتھ رکھ کر بولے: ”خدا اس دیہاتی زندگی سے بچائے۔ ابّا جان! اچھا ہوا آپ فوج میں آ گئے! ورنہ ہم بھی چھوٹے چوہدری کی طرح مویشیوں کے ساتھ سو رہے ہوتے اور مسجد میں جا کر نہاتے۔“

”لیکن چھوٹا چوہدری تو اس زندگی سے بھی ناخوش نہ تھا۔“

”ابّا جان! اس نے کبھی کوئی بنگلہ اندر سے دیکھا تھا؟“

”میرا خیال ہے نہیں۔“

”تو پھر وہ ناخوش کس بات سے ہوتا۔ انگریزی کہاوت ہے، لاعلمی بھی نعمت ہے۔“

میٹرک کا امتحان دینے کے لئے سلیم میاں نے یہ کہاوتیں تازہ تازہ یاد کی تھیں۔

ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”کہاوت تو تمہاری ٹھیک ہی کہتی ہے۔“

”مگر ابّا جان! بے چارے ماسٹر جی کا کیا بنا؟“

”بنا یہ کہ ماسٹر جی نے غسل کے بعد ناشتہ کیا اور پھر رخصت ہو گئے۔“

”ناشتہ؟ چوہدری کے گھر میں کارن فلیک تھے؟“

”کارن فلیک تو نہ تھے۔ البتّہ جو کچھ دال دلیا تھا غریب نے حاضر کر دیا۔“

”ابا جان! اس کے بعد چھوٹا چوہدری تو اسکول میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا ہو گا؟“

”نہیں بیٹا۔ اسکول تو وہ اسی منہ کے ساتھ گیا اور شہری لڑکیوں نے اس سے کچھ مذاق بھی کیا۔۔۔ مگر وہ مگن رہا۔“

”چوہدری کی جگہ میں ہوتا تو شرم سے مر جاتا۔“

”مگر چوہدری تو جیتا رہا بلکہ خموشی سے پڑھتا بھی رہا اور آخر میٹرک پاس کر کے لاہور کالج میں چلا گیا۔“

”وہ کالج بھی گیا؟ کیا ان کے پاس اتنے پیسے تھے؟“

”پیسے تو کم ہی تھے مگر انہوں نے تھوڑی سی زمین بیچ دی۔“

”مگر تھوڑی سی زمین سے کیا بنتا ہے؟ کالج میں رہ کر کھانا ہوتا ہے۔ کچھ پینا ہوتا ہے۔ کیا وہ مکئی کے بھٹّے کھاتا تھا؟ کیا وہ پتھر باندھتا تھا۔“

”بس گزارا کر لیتا تھا۔“

”گزارا ہی کرتا رہا یا کچھ پڑھ بھی گیا؟“

”ہاں۔ کچھ پڑھ بھی گیا۔“

"پھر۔"

"پھر جیسا کہ ان کا دستور تھا فوج میں بھرتی ہو گیا۔"

"پھر تو آپ اسے جانتے ہوں گے۔ کیا وہ آپ کے ماتحت کام کرتا ہے؟"

"ماتحت تو نہیں مگر جانتا ضرور ہوں۔"

"تو ابّا جان اسے بلایئے نا کبھی ہم چھوٹے چوہدری کو دیکھیں گے۔"

"دیکھیں گے؟ وہ کوئی تماشا تو نہیں، سلیم میاں۔"

"ابّا جان! بلایئے نا چھوٹے چوہدری کو۔ ہم بالکل نہیں ہنسیں گے۔"

"سچ۔"

"بالکل سچ۔"

"تو پھر آؤ ملو چھوٹے چوہدری سے۔۔۔" اور یہ کہہ کر میں نے سلیم کی طرف بازو پھیلا دیئے۔ سلیم ایک لمحے کے لئے مبہوت کھڑا مجھے دیکھتا رہا اور پھر یہ کہ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"ابّا جان! آپ؟"

سلیم اور علی بخش دونوں کی آنکھیں نم تھیں اور دونوں کی آنکھوں میں ایک دیہاتی کے لئے محبّت کی چمک تھی۔ ایاز اپنے اصلی لباس میں بھی ایسا معیوب نظر نہیں آتا تھا!

# بیروت میں قائدِ اعظم منزل

نوٹ: یہ چھوٹا سا شذرہ ''بسلامت روی'' کی باقیات میں سے ہے جو کتاب کا حجم گھٹانے کی غرض سے مسودے سے حذف کر دیا گیا تھا۔ پس منظر یہ ہے کہ ہم عبدالرحمان ڈرائیور کے ساتھ بعلبک کی سیر کے بعد بیروت کو لوٹ رہے ہیں۔ راہ میں عبدالرحمان اپنی منگیتر سے سرور آور ملاقات کر چُکا ہے اور نہایت خوش ہے۔

اسی خوشی میں رحمان نے ایک نئی پیشکش کی کہ واپسی پر ہوٹل جانے سے پہلے گراٹو کی سیر کی جائے۔ ہم نے کہا:

''گراٹو کیا شے ہے؟''

بولا: ''گراٹو کہتے تو غار کو ہیں، لیکن اس کے معنی سُن کر وہ لطف نہیں آتا جو اسے دیکھنے میں آتا ہے۔ شالامار باغ کے معنی تو ڈکشنری میں بھی مل جاتے ہیں لیکن باغ دیکھنے کا لطف کچھ اور ہی ہے۔''

ہم نے کہا: ''چلیئے گراٹو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم سیرِ گُل ہی کو تو نکلے ہیں۔''

کوئی نصف گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ہالہ نما پہاڑ کے دامن میں گراٹو کے دروازے پر کھڑے تھے۔ یہ در اصل دروازہ نہ تھا دروازے کی مونث تھی اور مونث کی بھی تصغیر کہ یہ دروازہ پائے کوہ اور زمین کے درمیان ایک باریک سی نہر کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس قدر تنگ کہ کشتی پر بیٹھے ہوئے بھی سر جھکانا پڑا کہ کہیں کشتی

آگے اور سر پیچھے نہ رہ جائے اور سر کی سلامتی کے بعد بھی توقع اسی قدر تھی کہ غار کی تاریکی کو ایک دیاسلائی سے ٹمٹما کر ایک قدم آگے جائیں گے اور پیشتر اس کے کہ کسی چٹان سے ٹکرا کر سچ مُچ سر پھوڑ ڈالیں دوسری دیاسلائی جلا کر واپس آ جائیں گئے۔ مگر ایک دفعہ غار کے دروازے سے گزر چکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک رنگ و نور میں نہائے ہوئے فلک نما گنبد کے نیچے تیرتے جا رہے ہیں اور خدا جانے یہ سیپ تھے یا گھونگھے، نیلم تھے یا عقیق، سونا تھا یا چاندی، گنبد کی چھت اور دیواروں سے پگھل پگھل کر ہزار قمقمہ فانوسوں، ہزار گل شاخوں اور ہزار شیوہ بتوں کے روپ میں ڈھل گئے تھے۔ اجسام و اشکال کے اس حیرت کدے میں ہماری حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسی پریوں کی کہانی سنتے بچّے کی ہوتی ہے۔ بیک وقت مسرور و مسحور! چلتی کشتی میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نئی نرالی دنیا میں آ نکلے ہوں اور اس کے صانع نے ہمارے اعزاز میں نہر کے دونوں طرف اپنے شاہکاروں کی گارڈ آف آنر کھڑی کر دی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم کشتی میں بیٹھے تیر نہیں رہے بلکہ ایک اُڑنے والے قالین پر بیٹھے فضاؤں میں پرواز کر رہے ہوں، لیکن ناگہاں، ایک انسانی آواز سنائی دی۔ ایک ایسی سحر شکن آواز جس نے گویا

ہمارے پیچھے سے اُڑنے والا قالین کھینچ لیا ہو اور ہم دھڑام سے کشتی کے تختے پر آ گرے ہوں۔ یہ آواز کشتی بان کی تھی جو بے چارہ اس گلاب کدے کو ہر روز دیکھ دیکھ کر تحیّر کی دولت سے محروم ہو چکا تھا۔ مشین کی طرح کہنے لگا:

"خواتین و حضرات، اب ہم نپولین کارنز سے گزر رہے ہیں۔"

ہم نے آنکھیں ملیں۔ پھر کھولیں۔ لاریب نہر کے موڑ پر لمبا کوٹ اور لمبوترا ٹوپ پہنے نپولین بوناپارٹ کھڑا تھا۔ یہ مجسمہ قدرت نے اپنے ہاتھ سے نپولین کو دیکھے بغیر بنایا تھا۔

چند قدم آگے گئے تو کشتی بان حسبِ معمول چلایا:

"یہ چرچل سکیٹر ہے۔"

اور غور سے دیکھا تو سامنے ایک ٹیلے پر جو برف و پنبہ کی رولی پولی نظر آتی تھی، دراصل ونسٹن چرچل کا چرٹ تھامے چیروبی چہرہ تھا۔ کشتی رواں تھی اور ہم سوچ رہے تھے کہ دیکھئے مشاہیر کی اس پریڈ میں قدرت اب کس ہستی کو پیش کرتی ہے۔ کوئی بیس گز آگے بڑھے ہوں گے کہ دائیں جانب ایک دُبلا پتلا اور بلند و بالا مجسمہ نظر آیا جس کا ایک بازو فضا میں بلند تھا۔ یہ انداز مانوس سا لگا اور غور سے دیکھا تو باقی مشابہت بھی تقریباً مکمل تھی۔ پیشتر اس کے کہ کشتی بان کچھ کہتا، ہم نے با آوازِ بلند کہا:

”خواتین و حضرات یہ قائد اعظم منزل ہے۔ اب آپ پاکستانی علاقے سے گزر رہے ہیں۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

معاً ہم نے اُٹھ کر قائد کو سلیوٹ کیا۔ سب مسافر ہماری طرف دیکھنے لگے، لیکن ہماری کسی تشریح سے پہلے عبدالرحمان نے عربی میں قائد اعظم منزل کی وجہ تسمیہ بالتفصیل بیان کر دی۔ اہلِ کشتی نے ازراہِ خیر سگالی تالیاں بجادیں اور اس طرح دیارِ غیر میں ہم نے بابائے قوم کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

# خیالاتِ پریشاں

خواتین و حضرات![6]

میں ایک سپاہی ہوں اور تقریریں کرنا میرے کاروبار میں شامل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چار پانچ آدمیوں کی موجودگی میں بولنا پڑے تو گھبرانے لگتا ہوں۔ اگر سامعین کی تعداد پانچ سے تجاوز کر جائے تو دِل ڈوبنے لگتا ہے اور سچ مُچ دس تک پہنچ جائے تو نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں۔

آج سامعین کی تعداد دس سے کچھ زیادہ ہے۔ ان مخدوش حالات میں بھی اگر اسٹیج پر کھڑا ہوں تو اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے کہ ملک کے بہترین طبیب میرے سرہانے بیٹھے ہیں۔

آج سے کچھ روز قبل جناب حکیم محمد سعید نے مجھے شام ہمدرد میں تقریر کرنے کی دعوت دی تو میں نے دعوت کا صدمہ برداشت کرنے کے بعد بڑی مخلصانہ معذرت

---

[6] یہ مقالہ مارچ ۱۹۶۸ء میں شام ہمدرد راولپنڈی میں پڑھا گیا۔

پیش کی کہ "قبلہ سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری، خطابت کے میدان میں پورے خاندان کی تاریخ میں سناٹا چھایا ہوا ہے، آپ تقریر نہ کرائیں کوئی اور خدمت میرے سپرد کر دیں۔ مثلاً شام ہمدرد کیلئے سکیورٹی فورس کا انتظام وغیرہ۔" حکیم صاحب نے بہ کمالِ فیاضی ہماری معذرت رَد فرمائی اور پوچھا: "اب کس موضوع پر بولو گے ؟"

ہم نے وید ہٹ کے تیور دیکھے تو ہتھیار ڈال دیئے۔ البتہ انتخابِ موضوع کیلئے مہلت مانگی کہ اس وقت مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا۔

موضوع کی تلاش کو نکلے تو شمس تبریز کی تلاش ثابت ہوئی۔ ہر کجا پھرے، لیکن موضوع نہ ملا۔ سید ضمیر جعفری سے اس کا پتہ پوچھا۔ کیپٹن صدیق سالک سے مشورہ کیا۔ مایوس ہو کر مولانا روم کے الفاظ میں جملہ دوستوں سے التجا کی کہ:

بروید اے حریفاں، بکشید یار مارا

بمن آورید حالا، صنم گریز پارا

اگر او بوعدہ گوید کہ دم دگر بیاید

مخورید مکر رورا بفریبد او شمارا

لیکن ہمارے دوست ناکام پھرے اور ہمارا موضوع گریز پا ہی رہا۔ باچار ہم نے حکیم صاحب کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا کہ

آج ہم اپنی پریشانئ خاطر ان سے

کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اور گئے تو حکیم صاحب نے نہایت سکون سے فرمایا "خیالات پریشاں معلوم ہوتے ہیں؟"

عرض کیا: "آپ کی تشخیص بالکل بجا ہے۔"

بولے: "'خیالاتِ پریشاں' اچھا موضوع ہے۔۔۔" اور دوسرے روز اخبار میں اعلان کر دیا۔

معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ اس موضوع پر تو ایک جانے پہچانے بزرگ پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ چلو ان کی خوشہ چینی سے شاید کچھ حاصل ہو جائے۔ چنانچہ کیانی جنت مکانی کی "افکارِ پریشاں" کی ورق گردانی شروع کی لیکن پڑھنے لگے تو اس مردِ حق گو کی بے باکی اور شیریں بیانی میں کھو گئے اور بھول گئے کہ کچھ لکھنے بیٹھے تھے۔

آنکھ کھلی تو محسوس ہوا جیسے کیانی مسکراتے مسکراتے نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہوں اور واپس فردوس کو جارہے ہوں۔ میں آواز دیتارہ گیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیئے؟

لیکن جاتے جاتے کیانی ایک اشارہ کر گئے کہ اپنے موضوع کیلیئے فلسفے یا مابعد الطبعیات کی دنیا میں جانے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی یہ ایک نیم خواندہ سپاہی کے بس کی بات ہے۔ کارِ جہاں بجائے خود دراز ہے۔ اسی جہاں میں بہت سے موضوع ہیں۔ اس نمائش و آرائش اور اس کھیل تماشے کی دنیا میں بہت سے کام جو بظاہر بے وقعت نظر آتے ہیں، آج بھی کردنی ہیں اور بہت سی باتیں جو بے وقت معلوم ہوتی ہیں آج بھی گفتنی ہیں۔ یہ اسلام کا جعلی احترام، یہ اینگلو پاکستانی کلچر کا ناز، یہ انگریزی بولنے کی وباء، یہ قوّالیاں اور یہ گھر والیاں۔ غرض یہ کہ سیدھی سادی باتیں کرنا۔

آیئے اس معاملے کی ابتدا اللہ کے نام سے کریں، یعنی اللہ میاں کو ایک اور لِپ سروس پیش کریں۔

خواتین و حضرات! آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ہم بہ حیثیت قوم کس وسیع پیمانے پر اللہ تعالی کی لِپ سروس کرتے ہیں۔ ہم ورائٹی شو کی ابتداء بھی کلامِ پاک کی تلاوت سے

کرتے ہیں، بلکہ سنا ہے کہ میرے ہمنام جو آج کل گوجرانوالے کی جیل میں مقیم ہیں اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی سے پہلے سورۃ فاتحہ پر دعائے خیر مانگتے تھے اور وطنِ عزیز کے وہ ابتدائی سال تو آپ کو یاد ہی ہوں گئے جب ہر جمعہ وزارتیں بدلتی تھیں اور ہر نئ کابینہ کے نومولود وزیر نئ شیروانیاں پہنے سورج ڈھلنے سے پہلے شاہی مسجد میں نمازِ جمعہ کیلئے پہنچ جاتے تھے، لیکن اس کے بعد برطرفی تک مسجد کا رُخ نہ کرتے تھے۔

اسی ضمن میں مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے جو ہمارے دوست مسعود مفتی نے بیان کیا۔ کہنے لگے، ولایت گئے تو ایک پرانے ہم جماعت سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے اشتیاق سے گلے مِلا۔ کھینچ کر ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں لے گیا۔ بیرے کو آرڈر دیا کہ تمام بہترین کھانے لے آؤ اور ہم سے اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کی کہانیاں بیان کرنے لگا۔ ان مہ وشوں کی کہانیاں جو اس کے شبستان کی زینت تھیں۔ ان مے نوشیوں کے قصّے جن کا خمار اسکی آنکھوں میں اس وقت بھی باقی تھا اور اس چور بازاری کی داستانیں جس میں وہ پونڈوں اور پاکستان کو ایک وار سے شکار کرتا تھا۔۔ اتنے میں بیرا کھانا لے آیا اور ایک پلیٹ میں پورک بھی رکھ لایا۔ ہمارے دوست نے دیکھا تو غیظ کے عالم میں بیرے سے مخاطب ہوا:

"بے خبر انسان یہ کیا حرام نشے لے آئے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں ہم مسلمان ہیں؟" بیرا معذرت کے بعد پلیٹ اُٹھا کر لے گیا اور ہمارے دوست نے اپنا اسلام بچانے کے بعد اپنی عیش کوشیوں کی داستان تمام تر فخر کے ساتھ جاری رکھی۔

پچھلے دنوں ہمارے اپنے ساتھ اس نوع کا ایک واقعہ پیش آیا۔

ایک دوست آئے اور فرمایا "خسر محترم جو بہت بڑے کلاتھ مرچنٹ بھی ہیں، حجِ بیت اللہ سے واپس آرہے ہیں۔ آؤ، ریلوے سٹیشن پر ان کا استقبال اور زیارت کریں اور ثوابِ دارین حاصل کریں۔ بلکہ مجھے مزید ثواب کی بشارت بھی دی۔" کہنے لگے "ہر چند کہ حاجی صاحب کے جلوس میں کاروں کا کارواں ہو گا، حاجی صاحب تمہاری کار میں ہی بیٹھ کر گھر جائیں گے۔ یہ خواہش میری نہیں خود حاجی صاحب کی ہے جس کا اظہار انہوں نے کراچی سے فون پر کیا ہے۔ ان کا یہ ارشاد بھی ہے کہ تم وردی میں آؤ تو اور بہتر ہے کہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ فوجیوں کے دلوں میں دیارِ حبیب سے لوٹنے والوں کی کیا قدر ہے۔"

محترم الحاج کی یہ فلاسفی مکمل طور پر تو سمجھ میں نہ آئی، لیکن ان کے استقبال کو بہر کیف دفتر سے اُٹھ کر جانا تھا، لہٰذا اسٹیشن پر گئے تو یونیفارم پہنی ہوئی تھی۔ حاجی صاحب نے اترتے ہی بکمال بندہ پروری اپنے عزیزوں کو چھوڑ کر اس خاکسار کو سینے سے لگایا اور اس زور سے بھینچا کہ محسوس ہوا، حج کا آدھا ثواب خاکسار کو منتقل ہو گیا ہے۔ کار تک پہنچنے

سے پہلے حاجی صاحب کے عزیزوں نے آپ کا سامان کار کی ڈگی میں رکھ دیا تھا۔ کار اسٹارٹ کی۔ چلنے لگی تو ہمارے اچھے بھلے صحتمند انجمن نے ہچکی لی اور رُک گیا۔ دوبارہ سٹارٹ کی۔ کار ذرا سر کی تو سہی لیکن فریاد کر اُٹھی کہ گناہ کا بوجھ بہت بھاری ہے۔ خدارا مجھے صراطِ مستقیم سے مت بھٹکاؤ۔ میں کار کی زبان سمجھ نہ سکا اور اس طرح ہم محصول کی چوکی سے بلا استفسار نکل گئے کہ چوکیدار نے ایک باوردی افسر کو روکنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اب سمگل شدہ سِلک اور نائیلون کے وزن کے پیچھے کار کے ایک ٹائر نے دم توڑ دیا۔ ہم نے حاجی صاحب کو مُڑ کر دیکھا کہ شاید ہمارے ٹائر کے غم میں شریک ہوں، لیکن آپ کے ہونٹوں پر ایک متبرّک سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ آپ ہماری یونیفارم اور سادگی کا جتنا استعمال ضروری تھا کر چکے تھے، چنانچہ ہمیں خدا حافظ کہے بغیر اُتر کر اپنی کار میں جا بیٹھے اور آپ کا سامان اُتار کر تین کاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔۔۔ اور میں ثوابِ دارین کی تکمیل کے سلسلے میں پنکچر لگانے والے کو ڈھونڈنے لگا۔

حاجی صاحب کا کاروبار بدستور چمک رہا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کو یاد کراتا رہتا ہوں کہ

دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

اسلام کی لِپ سروس[ے] کی داستان طویل ہے۔ آیئے اسے چھوڑیں اور کچھ اپنے کلچر کی باتیں کریں۔ پاکستانی کلچر ہمیں بہت عزیز ہے۔ تقریباً اتنا ہی جتنا ہمارا قومی پرچم۔ یہ نیک فال ہے اور یہی حبِّ وطن کا تقاضا ہے، لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے قومی پرچم کا ناک نقشہ اور قدو قامت تو بالکل واضح ہے۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ ہمارے کلچر کا حلیہ کیا ہے؟ یہ کِن اجزاء سے مرکب ہے؟ یہ کون سی بولی بولتا ہے اور کس انداز سے سوچتا ہے؟

آج سے بیس اکیس برس قبل پاکستان بنا تو ہر مسلمان گھر میں ایک امّی جان ہوتی تھیں اور ایک ابّا جان۔ کبھی لاڈ میں آئے تو ہم انہیں امّی اور ابّو کہہ لیتے تھے۔ ان دو الفاظ میں محبّت کی دنیا آباد تھی اور یہ ہماری ثقافت کا محبوب ترین سرمایہ تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد جوں جوں سستی دولت اور انگریزی تعلیم عام ہوئی، پاکستانی مائیں تیزی سے ممیاں بننے لگیں اور پاکستانی باپ ڈیڈیوں میں تبدیل ہو گئے۔ آج کل تبدیلی کا سوال نہیں کہ پاکستان کے بیس سال بعد اب خاصی تعداد پیدائشی ممیوں اور ڈیڈیوں کی ہو گئی ہے۔

حضرات ! یہ ممی ڈیڈی کی بات شاید معمولی بات ہے، لیکن میں جس گھر میں ان کا استعمال دیکھتا ہوں، ان کے کلچر میں ملاوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہماری قومی

---

[ے] Lip Service دکھاوے کی تواضع

وضعداری کے منافی ہے اور وضعداری عظمت کی نشانی ہے۔ وضعداری غریبی میں خودی کی نگہبانی ہے۔ ممی ڈیڈی کا استعمال قرآن کی رو سے تو شاید ناجائز نہیں، لیکن وضعداری اور عزّت نفس کے اعتبار سے ہماری شان کے شایان نہیں۔

ہم کبھی کسی پاکستانی کرسچن لڑکی کو اسکرٹ پہنے دیکھیں تو ہنس دیتے ہیں، لیکن ہمیں ہنسنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم خود گھر میں ممی ڈیڈی کہہ کر زبان کو سکرٹ پہنا رہے ہیں۔ بلکہ حقیقت میں وہ کرسچن خاتون زیادہ قابلِ احترام ہے جس نے ڈٹ کر پاکستانی ثقافت کو خیر باد کہا ہے لیکن ہم اس جرات کا اظہار نہیں کرتے۔ ہم دِل اور زبان سے سکرٹ پوش ہیں۔ لیکن خوفِ خلق نے سکرٹ پہنتے نہیں۔ اس خاتون کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ ہمارا کردار عمر خیام کے زاہد سے کچھ ملتا جُلتا کردار ہے۔ جناب زاہد نے ایک فاحشہ کو لعن طعن کیا تھا اور فاحشہ نے جناب زاہد سے فقط چھوٹا سا سوال کیا تھا۔

زن گفت کہ من آں چہ نمایم، ہستم

تو نیز چناں کی می نمائی ہستی[۸]؟

---

[۸] خاتون بولی کہ میں تو جو کچھ ہوں وہی دکھائی دیتی ہوں۔ کیا آپ بھی ویسے ہی ہیں جیسے نظر آتے ہیں۔

حضرات !زبان کا ٹیڈی پن لباس کے ٹیڈی پن سے کہیں زیادہ مہلک ہے حالانکہ لباس کے ٹیڈی پن کے متعلق ہم لوگ ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں۔ ذرا لڑکوں لڑکیوں کو چست کپڑوں میں دیکھ لیں تو ہمیں ملّت و دین کا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا ہے۔ بے شک ہمارے طلباء و طالبات ذرا ڈھیلے کپڑے پہن لیں تو انہیں سانس لینے میں آسانی ہو، لیکن عالمِ شباب میں سانس لینا ہی سب سے اہم بات نہیں۔ بہرحال لباس کا ٹیڈی پن اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں جتنا دِل و دماغ کا ٹیڈی پن اور آپ جانتے ہیں کہ دِل و دماغ کا ٹیڈی پن کیا ہوتا ہے ؟ایک زمانہ تھا کہ استاد یا باپ کی نصیحت سُن کر جی چاہتا تھا کہ ہدیۂ دِل پیش کیجئے، لیکن آج نصیحت کے جواب میں فرزند دِل بند ہنس کر کہتے ہیں:"Don't be silly, Dad"

اور دخترِ نیک اختر کا انداز امّی جان کے متعلق قطعی طور پر سرپرستانہ ہے۔ ہر سہیلی کو بتاتی پھرتی ہیں:

"Poor mummy, she is utterly old fashion"

یہ ہے خیالات کا ٹیڈی پن۔ ہمیں ان بچّوں کے لباس پر چراغ پا ہونے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ان کے خیالات پر۔ اور اس ضمن میں پریشان ہونے کی وسیع گنجائش ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کے ایسے گھروں میں جب کوئی غیر ملکی آتے ہوں گئے تو پاکستانی کلچر کے متعلق کیا سوچتے ہوں گئے۔ اس نقلی اور مانگے تانگے کے کلچر کے متعلق!

## کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ لباس کا ٹیڈی پن اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں، لیکن ایک اور صرف ایک صورت میں تنگ لباس بھی بہت بڑا سانحہ ہو سکتا ہے۔ یعنی جب پہننے والے یا والی کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو اور اس نے کپڑوں کے نیچے ذاتی چربی کا جوڑا بھی پہن رکھا ہو۔ ایک واقعہ کبھی نہ بھولے گا:

لاہور گئے تو کالج کے دنوں کے ایک دوست سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے پیار سے گھر کو لے چلے۔ راہ میں پوچھا کہ بھابھی کی صحت کیسی ہے؟ تو ذرا چونک کر بولے: "صحت؟ بڑی شاندار ہے۔" بھابھی کو دیکھے کوئی بیس برس ہو گئے تھے۔ ان دِنوں ہماری ہم جماعت ہوتی تھیں اور ذہن میں وہی ایک ہلکی پھلکی لڑکی کا تصوّر تھا لیکن دوست کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پورا صوفہ ایک خاتون سے بھرا پڑا ہے۔ یہی ہماری بھابھی تھیں۔ انہیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہماری بھابھی کی صحت اتنی طب کے لحاظ سے اچھی نہیں جتنی رقبے کے لحاظ سے۔ اور اس سونے پر جو سہاگہ، بھابھی جان نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا وہ ایک ٹیڈی سوٹ تھا جس کا ہر بخیہ اس انگڑائی کی شوخی کا فریادی تھا جو ہمارے جانے سے ایک لمحہ پہلے ظہور میں آئی تھی۔ ہم نے بھابھی جان کے کپڑوں کا تاؤ دیکھا تو معاً وہ شعر یاد آیا جو کسی نے احمد فراز کی اس غزل پر تضمیماً کہا تھا جس کا قافیہ تھا: کتابوں میں ملیں، سرابوں میں ملیں۔ شعر یہ تھا:

چست جامے میں وہ بیٹھے ہیں کچھ اس طرح فراز

جس طرح پھولے ہوئے پاؤں جرابوں میں ملیں

لیکن حضرات! دِل لگی سے قطع نظر ہم ایک نہایت اہم مسئلے پر غور کر رہے ہیں، یعنی خیالات کا ٹیڈی پن۔ ٹیڈی ذہنیت کا بنیادی اصول تن آسانی ہے۔ یہ لوگ اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے ہر قدم پر شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ صراطِ مستقیم سے یہ اس لئے کتراتے ہیں کہ یہ ذرا لمبی ہے اور اس میں چند سخت مقام آتے ہیں۔ چنانچہ کوئی مسئلہ درپیش ہو اس کے حل کیلئے یہ "میڈ ایزی" قسم کا فارمولا تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اب ان فارمولوں کے استعمال میں اکثر اوقات قانون، شریعت اور شرافت کو بھی شارٹ کٹ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انہیں قانون کا خوف ہرچند کہ ہے کم ہے اور خدا کا خوف کم تر کہ ایک مدّت سے خُدا ان کے نصاب میں ہی شامل نہیں اور خدا کے رسول سے تو انہیں اچھی طرح تعارف بھی نہیں۔

چنانچہ انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو مثلاً کیمرے یا اسکوٹر کی جو دنیا بھر کے ٹیڈیوں کو مرغوب ہیں اور باپ خریدنے سے قاصر ہو تو ان کے حصول کا ایک شارٹ کٹ بھی ہے: چوری! اگر امتحان میں کامیابی مشکوک نظر آئے تو اس کا ایک ٹیڈی حل بھی ہے: نقل! اگر مرضی کی شادی میں ماں باپ مزاحم ہوں تو اس تکلیف کو رفع کرنے کیلئے دو تین قسم کے شارٹ کٹ موجود ہیں!

حضرات! ہم ان شخصی شارٹ کٹس کو شاید فراموش بھی کر سکتے ہیں، لیکن انہی زندگیوں کا مجموعہ ہماری قومی زندگی ہوتی ہے، لہٰذا ان کا خمیازہ ساری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ شارٹ کٹس کی ہی ذہنیت ہے کہ ہمارے جوانوں میں کسی کام کیلئے شدید جذبہ یا گہری لگن ناپید ہے۔ یہ لوگ منزل تک پہنچنے کیلئے آسان راہیں ڈھونڈتے ہیں۔ محنت اور ریاضت کی پُرخار وادی کے تصوّر سے ہی انہیں چھالے پڑنے لگتے ہیں۔ یہ صرف بنی بنائی ٹھنڈی سڑکوں پر ہی چلنا جانتے ہیں۔ اور وہاں بھی کسی دوسرے کی سواری میں لفٹ لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا تجربہ گاہوں اور کتب خانوں میں دم گھٹنے لگتا ہے۔ قلمی نسخوں کے متلاشی انہیں دیوانے معلوم ہوتے ہیں اور ریسرچ کرنے والے مجذوب!

آپ ٹیڈی کو کسی علمی مذاکرے میں نہ پائیں گے کہ وہاں کامِکس سے مختلف باتیں ہوتی ہیں۔ کسی مشاعرے میں نہ دیکھیں گے کہ وہاں کوئی غزل انگریزی میں نہیں پڑھی جاتی۔ یہ کسی مسجد میں نہ جائے گا کہ نہ اسے سورۃ فاتحہ یاد ہے نہ رکوع و سجود کا سیاق و سباق۔ وہ "شام ہمدرد" میں بھی نہ پھٹکے گا کہ یہاں بہرحال اگلے وقتوں کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔۔۔ ٹیڈی کا نشیمن سینماؤں کے میٹنی شو ہیں۔ وہ پہاڑوں پر بھی بسیرا کرتا ہے، لیکن وہ اقبال والا پہاڑ نہیں، بلکہ مری کے بازار میں گرجا گھر کے قریب میں اسکینڈل پوائنٹ پر! اقبال نے بہت مایوس ہو کر کہا تھا:

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی

رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

ہر چند کے شیر مردوں کے فقدان سے دِل خون ہے تاہم اسی تہی پیشے میں صوفی و ملّا کا دم بھی غنیمت تھا کہ اللہ اور رسول کا نام تو لیتے تھے، لیکن آئندہ جب پیشۂ تحقیق ٹیڈیوں سے بھرنے لگے گا تو وہاں صرف فرینگ سناترا اور مرلن منرو کے غلام ہی رہ جائیں گے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس ذہنی کج روی کی وجہ کیا ہے۔ اس ضمن میں میرا اپنا ایک نظریہ ہے اور وہ یہ کہ اس کی بنیادی وجہ انگریزی کا ذریعہ تعلیم ہونا ہے، بلکہ میرے نزدیک معاشرے کی بے شمار برائیوں کی جڑ انگلش کا تعلیمی میڈیم ہونا حاضرین! مجھے انگریزی زبان سے قطعاً کوئی بیر نہیں۔ انگریزی میں علم و ادب کا انمول خزانہ ہے اور اس خزانے کی تہہ تک پہنچنا خوبیٔ قسمت کی انتہا ہے، بلکہ جو خوش قسمت لوگ انگریزی علم و ادب کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں ان کی طبیعت میں ٹیڈی پن کے بجائے ایک آسودگی بخش ٹھیراؤ آ جاتا ہے اور ان کے ظرف میں پختگی اور وسعت پیدا ہوتی ہے، لیکن انگریزی پڑھنا اور چیز ہے اور انگریزی میں پڑھنا اور چیز۔ خصوصاً ابتدائی جماعتوں میں۔ کیونکہ اگر پانچ چھ سال کے بچّے کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہو تو وہ صرف انگریزی ہی نہیں سیکھتا، انگریزیت بھی سیکھتا ہے۔ گویا ٹیڈی پن انگلش میڈیم کی ضمنی

پیداوار ہے۔ یہ نیم پخت اور نو عمر طلباء اور طالبات کی بیماری ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ٹیڈی پن چھوٹی عمر میں انگریزی کی بد ہضمی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر انہی سکولوں تک محدود ہے جن کا شروع سے ہی ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

آپ نے کبھی محسوس فرمایا کہ سینکڑوں دیہاتی اور شہری سکولوں میں جہاں ذریعہ تعلیم اُردُو ہے، ٹیڈی پن کا گزر نہیں؟ ان لڑکوں اور لڑکیوں کی زبان انگریزی بولنے پر اس حد تک قادر نہیں کہ جہاں الحمد للہ کہنا ہو وہاں قریب ترین لکڑی کو چھُو کر TOUCH WOOD کہیں اور جہاں انشاء اللہ کا مقام ہو وہاں انگلی پر انگلی رکھ کر بولیں:

I AM KEEPING MY FINGERS CROSSED

ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ٹیڈی پن کی ابتدا انگریزی بولنے سے ہوتی ہے۔ دوسری ٹیڈی خصوصیات بعد میں آہستہ آہستہ دَر آتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم بی اے پاس کر لیتے تھے لیکن انگریزی نہ بول سکتے تھے۔ لیکن انگریزی نہ بول سکنے سے کوئی آفت نہیں آجاتی تھی بلکہ انگریزی نہ بولنا اس اعتبار سے باعثِ رحمت تھا کہ ٹیڈی پن سے محفوظ رہتے تھے۔ آج پہلی جماعت کے بچّے فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ بیٹا بیٹی ماشاء اللہ انگریزی بول رہے ہیں۔ بچّے حیران ہوتے ہیں کہ یہ ماشاء اللہ کیا بلا ہے۔

میں آج والدین کو چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے بچّے اور خصوصاً بچیاں لئے ہوئے کانونٹ سکولوں کا طواف کرتے دیکھتا ہوں تو اقبال کی وہ چھوٹی سی نظم یاد آ جاتی ہے جس کا ابتدائی شعر ہے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ

اس سے اگلے شعر شاید آپ کو یاد ہوں

روش مغربی ہے مدّ ِ نظر

وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین

پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اقبال تو پردہ اُٹھنے سے پہلے خود اُٹھ گئے، لیکن یہ سین ہم دیکھ رہے ہیں۔

حضرات! وہ دن بچّے کی زندگی میں تاریخ ساز دن ہوتا ہے جب ماں باپ اس کے لئے سکول کا انتخاب کرتے ہیں اور وہ لمحہ تقدیر ساز لمحہ ہوتا ہے جب وہ ایک منہ بسورتے

بچّے کی انگلی پکڑ کر سکول کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ بچّے کو احساس نہیں ہوتا کہ اس کے کردار کی پہلی خشت رکھی جارہی ہے، لیکن ماں باپ اگر چاہیں تو صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آٹھ دس سال بعد جب بچّہ سکول سے نکلے گا تو مسلمان نکلے گا یا نیم مسلمان یا نامسلمان۔ ہم میں سے کتنے ماں باپ ہیں جو اسکولوں کے دروازے پر ایک لمحے کیلئے رُکتے ہیں اور اس معصوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوچتے ہیں کہ اس بچّے کا مستقبل ہمارے اگلے قدم میں ہے۔

آپ نے ضربِ کلیم میں شاید وہ نظم پڑھی ہوگی جس میں لُرد فرنگی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنے شکار کو تیغوں سے نہیں، تعلیم سے زیر کرو۔ علامہ کے الفاظ ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو

ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُدھر پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب

سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اور جہاں تعلیمی تیزاب کا شکار ہوں ہی یہ کم سن اور معصوم بچّے وہ کہاں تک اپنی خودی اپنے دین و ایمان کی حفاظت کر سکیں گے؟ یہ سونے کے ننھے ننھے ہمالے دیکھتے دیکھتے مٹی کے ڈھیر بن جائیں گے۔

کچھ عرصے سے ان مشن سکولوں میں بھی دینیات کی تدریس کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اور اس ضمن میں سجدۂ شکر لازم ہے اور میں خود تو شاید پہلے سجدہ گزاروں میں سے ہوں کہ ان سکولوں میں دینیات کی کلاسوں کے اجراء میں مجھے سرکاری طور پر کچھ دخل تھا، لیکن یہ تریاق انگلش میڈیم کے زہر کو ایک حد تک ہی زائل کر سکتا ہے۔

حضرات! انگریزی کو میڈیم کے طور پر استعمال کرنے کا شوق نہیں روگ ہے اور یہ انگریز کا قصور نہیں، بلکہ انگریز تو حیرت میں ہے۔ چند سال ہوئے انگلستان کے ایک مشہور ماہرِ تعلیم یہاں آئے۔ ہم انہیں ایک انگلش میڈیم سکول دِکھا چکے تو کسی قدر فخر کے ساتھ ان کی رائے پوچھی۔ ان کی رائے سُننے کے قابل ہے۔ کہنے لگے:

"بھئی آپ کی ہمت قابلِ داد ہے جو اپنے بچّوں کو ایک غیر زبان کے ذریعے تعلیم دے رہے ہو۔ اگر میں انگلستان میں انگریز بچّوں کو اُردُو کے ذریعے تعلیم دینے کی سفارش کروں تو مجھے یقیناً اگلی رات کسی دماغی ہسپتال میں کاٹنی پڑے گی۔ آپ واقعی بہادر ہیں۔"

خدا جانے اس انگریز کے ذہن میں کون سا لفظ تھا جس کی جگہ بہادر استعمال کر رہا تھا؟

حضرات! دفتروں میں ہماری فائلوں کی زبان انگریزی ہے۔ کاش یہ اُردُو ہوتی لیکن جب تک نہیں ہوتی شاید ہمارا فرض ہے کہ وہاں ہم انگریزی لکھیں اور بولیں بھی لیکن

کیا آپ کوئی معقول وجہ بتا سکتے ہیں کہ یہ حرکت ہم گھروں میں، بازاروں میں، اور تفریح گاہوں میں کیوں کریں؟ ہم ایک دوسرے کو انگریزی خط کیوں لکھیں اور انگریزی بھی ایسی جو اکثر غلط ہوتی ہے اور جس میں اپنے عالم تحریر و تقریر کا مدعا ہمیشہ عنقا رہتا ہے۔۔۔ ایک مدت ہوئی میرے ایک دوست کی شادی ہوئی تو ان کے دفتر کے بوڑھے ہیڈ کلرک نے انہیں انگریزی میں خط لکھا۔ صرف دو جملے تھے۔ پہلے میں شادی کی سکہ بند مبارک باد تھی اور دوسرے میں دفتری انگریزی میں دُعا۔ دعائیہ فقرہ یوں تھا:

"AND MAY GOD GRANT YOU A SON AT HIS EARLIEST CONVENIENCE"

خدا نے تو حسبِ معمول میرے دوست پر یہ عنایت ایک سال کے بعد ہی کی لیکن آپ نے انگریزی خط نویسی کا کرشمہ دیکھا کہ ہمارے کلرک نے خدائی کاموں کی رفتار بھی تیز کرنے کی کوشش کی، یعنی اللہ تعالی کو بھی EXPEDITER بھیج دیا۔

خطوں کا ذکر چل نکلا ہے۔ ہماری ہمسائیگی میں ایک نو بیاہتا ماڈرن لڑکی کو کسی مجبوری کے ماتحت اپنے خاوند کو اُردُو میں خط لکھنا پڑ گیا۔ لکھنے گئی تو ابتدائی القاب پر ہی رک گئی ۔ خالہ جان نے مشورہ دیا کہ بیٹی خاوند کو "سر تاجِ من سلامت" لکھتے ہیں۔ دلہن

وحشت کے عالم میں بولی: ”آنٹی! وہ بائیسکل نہیں، انسان ہیں۔ ذرا ڈارلنگ کے اُردُو سپیلنگ بتادو۔“

حضرات! زبان صرف مافی الضمیر کے اظہار ہی کا ذریعہ نہیں یہ اہلِ زبان کی تہذیب، معاشرت اور اخلاقی اقدار کی عکاس بھی ہوتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس خالص یا نیم انگریزی زبان سے جو ہم بولتے ہیں۔ کون سی تہذیب اور کون سی اخلاقی اقدار منعکس ہوتی ہیں؟ پاکستان سے تو انہیں بہت کم واسطہ ہے اور اسلام سے کم تر۔ کتنا بڑا سانحہ ہے کہ ہمیں اپنی زبان بولتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کسی سرکاری یا کاروباری ضرورت سے انگریزی بولنا شاید نامناسب نہیں، لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ ایسے ہیں جو یا تو فی سبیل اللہ انگریزی بولتے ہیں اور یا اپنی جھوٹی صاحب بہادری کی تائید میں۔ یہ ہے ان بڑوں کی پستی کا عالم! حضرات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مجبوری نہ ہو تو اُردُو بولا کریں۔ اگر آپ اُردُو بولتے ہیں تو ہماری نگاہ میں بہت محترم ہیں، لیکن اگر آپ کو انگریزی بولنے پر ہی اصرار ہے تو ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں اور یہ موضوع یہاں ختم کرتے ہیں۔

# قوّال اور قوّالیاں

خواتین و حضرات! چونکہ یہ افکارِ پریشاں کا معاملہ ہے، میرا اگلا خیال ایک مختلف مگر اہم اور خوفناک قومی مسئلے سے متعلق ہے اور وہ ہے قوّالی کا مسئلہ۔ جی ہاں یہی قوّالی جو ہم ریڈیو پر سنتے اور ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں آفاتِ ارضی و سماوی کی کمی نہیں۔ ویت نام میں جنگ ہو رہی ہے۔ ترکی میں زلزلے آرہے ہیں۔ ہندوستان میں بلوے ہو رہے ہیں۔ سوڈان میں ٹڈی آئی ہوئی ہے، پاکستان میں قوّالی آگئی ہے تو یہ ایسا ظلم نہیں جو اوروں پر نہیں ہوا۔ تشویش کا پہلو صرف یہ ہے کہ قوّالی کو ہماری قومی زندگی میں ایک تقدیس، ایک طہارت کا مقام حاصل ہے۔ پنڈی والوں کو علم ہے کہ قوّالی ہماری ہفتے وار عقیدت کا جزوِ اعظم ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ عبادت کا بدل ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ وہ لوگ کیا کریں جن کے ذوق کے لئے یہ پیامِ اجل ہے!

آیئے ذرا قوّالی سُننے چلیں۔ قوّالی شروع ہے اور آپ یک لخت جنگ گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ذرا دیکھئے یہ بکھرا ہوا قوّالوں کا پورا کنبہ، یہ بپھرا ہوا پدر قوال، وہ لہلہاتے

ہوئے دھڑ، وہ دندناتے ہوئے گلے، وہ دہاڑتا ہوا ہارمونیم، وہ چنگھاڑتا ہوا طبلہ، وہ ہنگامہ دار و گیر، وہ شورِ یوم نشور۔۔۔ اور تمام مار دھاڑ کا صیدِ زبوں، اقبال کی غزل کا بے یار و مددگار مصرع ''پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن'' اور آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے کوہ و دمن کو نہایت تیزی سے دس بارہ چکر دیئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ آخری مرحلوں میں ''کوہ دمن دمن کوہ و دمن کو ہو'' بن کر رہ جاتا ہے۔ خُدا جانے روحِ اقبال پر کیا گزرتی ہے۔ اس ضمن میں مجھ سے کہیں بہتر نقشہ میرے دوست سیّد ضمیر جعفری نے کھینچا ہے۔ انہوں نے قوّالی پر ایک مسدّس لکھی ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

تال دے کر جب کلامِ حضرتِ اقبال دیں

شعر کیا ہر لفظ کی چوکھٹ پر چوکی ڈال دیں

شعر دیں پھر پر چۂ ترکیب استعمال دیں

قافیوں کو دور تک کھینچیں ردیفیں ٹال دیں

فلسفہ تھا سرنگوں مفہوم خستہ حال تھا

شعر بچ نکلا تو یہ اقبال تھا

قوّال کو مباح ہے کہ جو چاہے گائے اور ہمارا فرض ہے کہ جو گائے اسے عارفانہ کلام سمجھ کر سر دُھنیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جو نہی قوّالی کی ابتداء ہوتی ہے اور سر قوّال ایک خضوع و خشوع کے عالم میں آنکھیں بند کرتے ہوئے اور ہاتھ بلند کرتے ہوئے الاپ شروع کرتا ہے تو خواتین سر پر ڈوپٹے اوڑھ لیتی ہیں۔ مرد دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور اور معرفت کی لَے ان الفاظ پر ٹوٹتی ہے:

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

سامعین میں سے ایک بزرگ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہیں اور رُندھی ہوئی آواز میں سرد آہ کھینچ کر کہتے ہیں، "سبحان اللہ۔ آہیں نہ بھریں۔۔۔"

ہمارے گاؤں کے مستری محمد دین بڑے مشّاق معمار تھے اور اتنے ہی مشّاق قوّالی کے رسیا تھے۔ گاؤں کی مسجد تعمیر کر چکے تو ایک مقبول قوّالی کا مقبول شعر مسجد کی پیشانی پر لکھ دیا۔ شعر تھا:

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

کہا جاتا ہے کہ علماء کے نزدیک راگ نامقبول کیا شے ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ یہ قوّالی اس فتوے کے زد سے کیسے بچ گئی اور فقط بچ ہی نہیں گئی، بالکل اسلام بی بی بنی بیٹھی ہے۔ اور

جب چاہے جہاں چاہے، امیر خسرو سے لے کر اقبال کے کلام تک ہر ایک کے اشعار پر دست درازی بلکہ زبان درازی کر سکتی ہے۔ اقبال کے کلام پر تو اس کا ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی زیادہ حق معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی دسترس سے فقط کلامِ پاک ہی محفوظ ہے کہ خود ذاتِ باری اس کی محافظ ہے ورنہ کئی قوّال آج بھی سورۃ رحمان پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے رہتے ہیں۔

حضرات! مجھے قوّالوں سے کوئی عناد نہیں۔ اگر قوّالی مذہبی لبادہ اُتار دے تو میرے نزدیک یہ ایک اچھا اور صحت مند تماشا ہے جس سے کئی لوگ، خصوصاً بچّے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ بچّوں کیلئے تفریح کے مواقع یوں بھی کم ہیں۔ میرے نزدیک ایک مثالی قوّالی کا نقشہ کچھ اس طرح ہے:

قوّالوں کا کنبہ حسبِ معمول جملہ آلات کے ساتھ بیٹھا ہے، لیکن انہوں نے عام ٹوپیوں کی بجائے لال رنگ کی مخروطی پھندنے دار ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ ان کے گرد و پیش رنگارنگ غبارے اُڑ رہے ہیں۔ دفعتہً قوّالی کی ابتدا ہوتی ہے، لیکن کلامِ اقبال کے بجائے صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کی نظم سے، جس کا ابتدائی مصرع ہے:

ایک تھالڑ کا ٹوٹ بٹوٹ

سامنے سینکڑوں شوخ بچّے ہنسی پر تُلے بیٹھے ہیں۔ ٹوٹ بٹوٹ کے نام پر اُن کے لبوں پر تبسّم پھوٹتا ہے۔ پھر جملہ قوّال حسبِ معمول بازو لہراتے ہیں اور لَے کبھی چھوڑتے ہیں کبھی گاتے ہیں اور بچّے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ گویا ایک نہایت کامیاب اور بامقصد قوّالی ظہور میں آتی ہے جس سے بچّے الگ محظوظ ہوتے ہیں اور شاعر یعنی صوفی تبسّم الگ داد پاتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روحِ اقبال کے سکون میں کوئی خلل نہیں آتا۔

## شاعر اور شاعراں

حضرات! آپ میں سے میرے کچھ بزرگ ہیں اور باقی دوست یا عزیز۔ میں بزرگوں کی اجازت سے دوستوں سے ایک دِل کی بات کہنا چاہتا ہوں:

میں نے کسی دوسری جگہ کہا ہے کہ ہمارے ہاں مسکراہٹوں کا توڑا ہے۔ ہم اپنے ملک کی فی مربع میل آبادی کا بڑی احتیاط سے حساب رکھتے ہیں، لیکن فی مربع میل ناخوشی کا اندازہ بھی نہیں کرتے حالانکہ حاصلِ زندگی آبادی کی کمی بیشی نہیں، بلکہ سکون اور مسرّت کی فراوانی ہے۔ شاید ہم خوشی کا حساب کرنے سے اس لئے بھی ہچکچاتے ہیں کہ سینکڑوں مربع میل میں خوشی کے خانے میں صفر ہی صفر ہے اور خصوصاً وہ چند میل جن میں بظاہر آباد شہر، چمکتے بازار اور دمکتے بنگلے واقع ہیں۔ خوشی کے پیمانے سے لق و

دق ویرانے ہیں اور یہاں کی ناخوشی وہ قدرت کی دی ہوئی ناخوشی نہیں یعنی مرض و مرگ کی ناخوشی، بلکہ وہ ناخوشی جو ایک انسان دوسرے انسان کو دیتا ہے، کبھی دانستہ اور کبھی عادتاً، یعنی احساسِ خطا کے بغیر۔۔۔ وہ ناخوشی جو ایک منہ زور افسر اپنے ماتحت کو دیتا ہے۔ ایک سنگ دِل صاحبِ اختیار حاجت مند کو۔ ایک خود بین منعم مفلس کو یا ایک کم توفیق شاعر اپنے قاری کو۔ جی ہاں اس آخری ناخوشی کا مجھے خاص طور پر شکوہ ہے۔

تقسیمِ مسرّت کے سلسلے میں ہمیں بڑے لوگوں کے متعلق تو کبھی ایسی خوش فہمی نہ تھی کہ ان کے کرم و ستم کا نزول بیشتر موڑ پر منحصر ہوتا ہے اور ان کے موڈ کی تشکیل میں چند غیر معتبر عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ مثلاً بیگم کا مزاج، منافع کی شرح، خواب گاہ کا درجہ حرارت اور ہاضمے کی کیفیت۔۔۔ ہمیں کچھ تکیہ تھا تو اپنے شاعروں اور ادیبوں پر کہ خوش قسمتی سے یہ نہ بہت بڑے افسر ہوتے ہیں اور نہ اپنے سوا کسی پر اختیار رکھتے ہیں لہٰذا دوسروں کو ناخوش کرنے کیلئے ان کے پاس کوئی معقول بہانہ نہیں، لیکن آپ اُن کی کوئی غزل اُٹھا لیں، کوئی افسانہ پڑھیں، ایک مسلسل روتا ہے ایک متواتر فریاد ہے۔ کسی کو خوش کرنا تو درکنار یہ غم بھی نہیں بٹاتے، بلکہ نیا غم بانٹے ہیں۔

یہ درست ہے کہ انسانی زندگی میں غم و یاس ہے، اس کی عکاسی لازم ہے، لیکن اسی زندگی میں مسرّتیں اور مسکراہٹیں بھی ہیں، ان کی تصویر بھی کھینچیں۔ راتیں بے شک

کالی اور دلخراش ہیں لیکن دن اتنے ہی روشن اور دِلربا ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ہنستے پھولوں اور گاتی ہواؤں سے تو گزر جاتے ہیں لیکن چبھتے کانٹوں اور چھوٹے آبلوں پر دیوان لکھ مارتے ہیں۔ بچّہ روتا ہے تو تبسّم بھی کرتا ہے۔ پھول مرجھانے سے پہلے کھِلتا بھی ہے۔

میں اگلے روز ایک اخبار میں "گل دستہ" پڑھ رہا تھا۔ یہ گُل دستہ قارئین کے مُنتخب اشعار کا مجموعہ ہوتا ہے، جو آج کل اخبار اور رسالے شائع کرتے ہیں۔ اس گلدستے کا موضوع "گل" تھا، یعنی 'پھول' جس کے تصوّر سے ہی کائنات مسکراتی نظر آتی ہے، لیکن آپ گلدستے کے صرف پہلے تین شعر سُنیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی مسرّت کی کوئی رمق نظر آئے تو براہِ کرم مجھے چائے کے وقفے میں آکر بتایئے گا جواب بہت دور نہیں! پہلا شعر تھا:

دامنِ گُل چاک ہے، ویراں ہے تزئینِ چمن!

یہ بہاریں ہیں کہ جن سے دِل کو بہلاتے ہیں ہم

مجھے یقین ہے کہ قریب ہی ایک آباد چمن بھی ہو گا اور شاعر محترم وہاں گئے بھی ہوں گے مگر وہ شعر جب بھی کہیں گے کسی ویرانے کا چکر لگا کر ہی کہیں گے۔

دوسرا شعر:

ابھی تو فصلِ گُل کی ابتدا تھی

نہ جانے پھول کیوں مرجھا گئے ہیں

بالکل ممکن ہے کہ پھول اسی لئے مرجھا گئے ہوں کہ مالی نے ابھی پانی نہ دیا ہو۔ اگر جناب شاعر ذرا صبر کر لیتے تو شاید مالی بھی کام پر آ جاتا اور پھول بھی کھکھلانے لگتے، لیکن وہ شاعر کیا جو پھولوں کے ہونے کا انتظار کرے۔

اور تیسرا شعر وہی عندلیب کو دعوتِ گریہ والا تھا، جو میں سمجھا تھا اب قصّۂ پارینہ ہو چکا ہے اور جس سے بہر حال کسی بُلبُل کو اتفاق نہیں یعنی۔۔۔

آ عندلیب مِل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دِل!

حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ شاعر حسبِ عادت چیخنا چلانا چاہتا تھا۔ سنگت کی خاطر ایک خوش مزاج بُلبُل کو ورغلانے لگا کہ چھوڑو ہنسی کو، آؤ مِل کر روئیں۔۔۔ قارئین کی خوشی کے خلاف اس سے بڑھ کر ایک شاعر کیا سازش کر سکتا ہے؟

---------

خواتین و حضرات! زندگی بہت مختصر ہے۔ غالب اسے برقِ خرام باندھتے ہیں۔ ہم اس کی بے اعتباری سے خوب واقف ہیں۔ کچھ معلوم نہیں یہ چلتا دِل کب تھم جائے۔

نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

آیئے اس چند روزہ زندگی میں دوسروں کے لئے خوشی کا اہتمام کریں۔ زیادہ نہ سہی، صرف ایک خوشی یومیہ۔ خواہ یہ خوشی آپ کے نوکر کے حق میں آئے یا آپ کے ہمسائے کے حصّے میں۔ خواہ اس خوشی میں سے کسی بے کس بیوی کو حصّہ ملے یا کسی بے بس خاوند کو۔۔۔ زندگی کے چند مستعار لمحوں کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں کہ دوسروں کو خوشی دینے میں گزر جائیں۔

عجیب بات ہے کہ خوشی بانٹنے سے یہ خزانہ خالی نہیں ہوتا، اور بھرتا ہے۔ یہ خزانہ ہم میں سے ہر ایک کے پاس ہے۔ میٹھی زبان کا خزانہ، دِل دردمند کا خزانہ، طبعِ موزوں کا خزانہ۔ آیئے اپنے خزانے کو اور فیاضی سے لُٹائیں۔ قبلہ حکیم صاحب نے یہ راز دریافت کر لیا ہے۔ وہ ہمارے لئے ہر ماہ شامِ ہمدرد کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ہمارے اردگرد سینکڑوں لوگ مسلسل شام ہائے درد بسر کر رہے ہیں۔ آیئے ان کی کسی ایک شام کو شامِ ہمدرد بنا دیں۔ یہ آپ کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ آپ چاہیں تو ویرانے میں بہار آسکتی ہے۔

بہاریں تم سے زندہ ہیں چمن تم سے عبارت ہے

تمہارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا

# سوال وجواب

(۱۹٦۷ء کی پاکستانی سیاست پر ایک طنزیہ)

سوال[۹]: اگر آپ کو لکھنے سے قانوناً روک دیا جائے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا؟

جواب: اگر ہمیں لکھنے سے قانوناً روکا گیا تو ظاہر ہے ہم اس کالے قانون کے احترام میں خاموش نہیں بیٹھے رہیں گے۔۔۔ آخر وہ کون سا سفید قانون ہے جو ہمارے ہاتھوں محفوظ رہا ہے؟ قانون برائے انسدادِ رشوت ستانی؟ چور بازاری؟ ذخیرہ اندوزی؟ خیر جانے دیجئے۔

لیکن اس نے کالے قانون کی بے احترامی ہم سلیقے سے کریں گے۔ لیکن ہر چند کے اربابِ اختیار کا مُدعا ہماری ذاتی بے حرمتی ہو گا تاہم جوش میں آ کر ہم کسی چھوٹی سی، چھچھوری سی قانون شکنی پر اپنا قیمتی غصّہ ضائع نہیں کریں گے۔ مثلاً یہ نہیں کہ ہم دفعتاً

---

۹ جن دنوں صدر ایوب کی حکومت تھی لاہور کے ایک رسالے نے اپنے لکھنے والوں کے نام ایک سوالنامہ بھیجا۔ اس میں یہ سوال بھی تھا جس کا مصنّف نے جواب لکھا۔

خاندانی منصوبہ بندی کا نزدیک تریں بورڈ تباہ کر دیں گے۔ ہماری اس حرکت سے نہ کوئی منصوبہ بند باز آئے گا اور نہ کوئی ہمارے گلے میں ہار ڈالے گا۔ ایسے جرائم خفیفہ سے ہماری شہرت میں بس معمولی یا مقامی سا اضافہ ہو گا اور وہ عاشق کیا جس کا جنازہ دھوم سے نہ نکلے۔

ہمیں توقع ہے۔۔۔ دراصل ہماری تمنّا ہے۔۔۔ کہ ہماری قلم بندی کا پروانہ کسی روز سہ پہر کو نکلے گا اور اس خبرِ وحشت اثر کو آدھی رات تک دو تین مرتبہ نشر کیا جائے گا تاکہ سارے ملک میں ہماری خاطر غم و غصّے کی لہر دوڑ سکے اور جب یہ لہر دوڑ چکے گی تو پھر ان کی آن میں ہمارا نام شہیدانِ قلم کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ ہم جوں توں کر کے رات گزاریں گے اور دوسرے روز علی الصبح یعنی جب لوگوں کے دلوں میں ستم ابھی تازہ ہو گا ہم پریس کانفرنس بلا لیں گے۔ ہمارا قلم قیدی سہی، ہماری زبان تو آزاد ہو گی۔ جو کچھ لکھ نہ سکیں گے، بول دیں گے۔ بلکہ قوم کی گردن میں فرضی باہیں حمائل کرتے ہوئے ایک رندھی ہوئی آواز میں اسے یہ بھی کہیں گے کہ

آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں، وغیرہ

اس پر قوم کی آنکھیں بھیگ جائیں گی اور ہمارا اندازہ ہے کہ اس کالے قانون کے مصنّف کا دِل بھی اپنے ظلم کی داستان سُن کر پسیج جائے گا لیکن آپ اور غالب شاید یہ کہیں کہ تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہربان کیوں ہو؟ تو چلو نہ سہی، ہمارے سیاسی

ترکش میں کچھ اور تیر بھی ہیں لیکن اپنی پریس کانفرنس کی تاثیر دیکھنے کے لئے ہم اگلی صبح کے اخباروں کا انتظار کریں گے۔

اگلے روز غالب کا خدشہ غالباً ٹھیک نکلے گا۔ لیکن نہ صرف صاحبِ قانون ہم سے یہ نہ پوچھیں گے کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو بلکہ سارا پریس۔۔۔ سوائے ایک اخبار کے۔۔۔ ہماری تقریر کو بلیک آؤٹ کر دے گا۔ ان خیالات میں ہمارے پاس راست اقدام کے بغیر چارہ کار نہ ہو گا۔

ہم بلا تاخیر قریب تریں بار روم کا رُخ کریں گے جہاں امید ہے کہ کئی معزز و محبِّ وطن وکلاء پریکٹس پر لات مار کر قوم کا غم کھا رہے ہوں گے۔ یعنی صرف ہماری کمی ہو گی ورنہ میٹنگ پہلے ہی آراستہ ہو گی۔ ہماری تقریر کی ابتدا جرگہ سسٹم کی بربریت سے ہو گی کیونکہ بار روم کے لئے اس سے زیادہ دلگداز موضوع کوئی نہیں۔ حسبِ دستور ہم جرگہ سسٹم کی دھجیاں بار روم کی فضا میں اور فرش پر بکھیر دیں گے، جس سے توقع ہے کہ ہر صاحبِ دِل وکیل پر رقّت طاری ہو جائے گی۔ ایسے موافق ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم یک لخت اپنے موضوع کی طرف لوٹیں گے اور آزادئ تحریر کی خاطر جان دینے کی دھمکی دیں گے۔ جی ہاں وہی "مقدس آزادی" جس کی خاطر اسلام اور یو این نے ضمانت دے رکھی ہے۔ اگر کسی نے اسلامی ماخذ کا حوالہ پوچھنا چاہا تو ہم آنکھوں سے

آنسو پونچھتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کریں گے کہ دراصل ماخذ کا ہمیں بھی علم نہیں اور آخر میں اچانک سیاست میں داخلے کا اعلان کر کے ہم خود بھی بیٹھ جائیں گے۔

یہ سُن کر ملک کی تمام بار ایسوی ایشنیں بشمول بار ایسوسی چیچو کی ملیاں ہمارے اعزاز میں پر امن جلوس نکالیں گی اور ریزولیوشن پاس کریں گی۔ ہم ان قراردادوں کی نقلیں براہِ راست اوتھان کو بھجوا دیں گے۔ یہ دستاویزیں شاید اوتھان کے نروان کا سامان تو نہ بن سکیں، لیکن ہماری فلاح کی ضرور ضامن بنیں گی اور وہ اس طرح کہ یہ خبر یک لخت بین الاقوامی اہمیت اختیار کر جائے گی۔ آکاش وانی سے اسی رات ہماری قلم بندی کے سانحہ کی خبر نشر ہو گی، یعنی اس ظلم کی خبر جو بھارت میں کبھی ہوا ہی نہیں۔ اس ظالمانہ لاٹھی چارج کی بھی تفصیل ہو گی جو ہم پر ابھی ہونا باقی ہو گا اور پردھان منتری تو ہمدردی کے بارے میں مبارک باد کا تار بھیجیں گی کہ ہم ان گولیوں سے محفوظ رہے جو ہم پر چلائی ہی نہیں گئی تھیں!

اس شدید قومی اور بین الاقوامی ردِّ عمل پر حکومت کو بے بس ہو کر ہمارا قلم آزاد کرنا پڑے گا، لیکن اگر حکومت یہ تمام تر ملکی اور دساوری احتجاج پی گئی تو ہمیں یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف کسی موزوں مقام پر۔۔۔ مثلاً کسی کالج کے قریب۔۔۔ آواز اُٹھانا پڑے گی۔ پھر ظاہر ہے کہ باقی ذمہ داریاں ہمارے کالج کے برخوردار خود سنبھال لیں گے۔ یعنی پُر امن جلوس ترتیب دیں گے جس کی روانی میں ٹریفک کی بتّیاں، ڈبل ڈیکر

بسیں اور مکانوں کے شیشے بلاوجہ مزاحمت کریں گے اور بے بس بچّوں کو حفاظتِ خود اختیاری کے تحت دو چار کنکریاں اِدھر سے اُدھر پھینکنا پڑیں گی۔ لیکن بچّوں کی انتہائی احتیاط اور نیک نیتّی کے باوجود چند بسیں اور ٹریفک سگنل ذرا شہید ہو جائیں گے، جس کا ہمیں بہت افسوس ہو گا اور ہمارے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر حکومت ہمارے قلم کی آزادی کا اعلان کر دے گی۔

ویسے سوچا جائے تو ہمارا قصور بھی کیا تھا جو ہمارا قلم قید کر لیا گیا؟ یہی کہ ہم نے کسی جگہ لکھا تھا کہ ملک میں چمچوں[10] کی صنعت نے فقید المثال ترقی کی ہے اور یہ کہ اس شعبے میں ہم نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ دوسرے ترقی پذیر ممالک کی ضروریات بھی پوری کر سکتے ہیں۔ لہٰذا چمچوں کی تجارت کے ہم نے کئی فوائد بھی گنوائے تھے۔ مثلاً یہ کہ وطنِ عزیز کی کئی دوسرے ملکوں میں ساکھ بڑھے گی اور وہ چند چمچے جو ملک میں رہ جائیں گے، چشم چمچہ ساز میں عزیز تر ہو جائیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ معقول مقدار زر مبادلہ کی بھی حاصل ہو گی۔ بس اتنی سی بات پر ہمارے قلم پر پابندی لگا دی گئی۔ حالانکہ ان فوائد کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ماہرین نے فالتو چاول کی ایکسپورٹ کا مشورہ دیا تھا جس سے کروڑوں کا فائدہ ہوا۔ تجارت کی رو سے تو ہمیں چاول اور چمچوں میں کوئی

---

[10] صدر ایوب کے زمانے میں خوشامدی حاشیہ نشینوں کے لئے چمچے کی اصطلاح بڑی مقبول ہوئی تھی۔

خاص فرق نظر نہیں آتا۔۔۔ بہر حال دیکھا آپ نے اس قلمبندی کا حکم دینے والے سیکشن افسر کی کوتاہ اندیشی کا نتیجہ ؟ایک طرف تو ملک کو بیش بہازر مبادلہ سے محروم کر دیا اور دوسری طرف ایک مرنجاں مرنج قلمکار کو مشتول کر کے جنابِ صدر کے لئے ایک اور حریف پیدا کر دیا۔

# عشق پر زور نہیں

.(نوٹ یہ واقعہ ان ہی واقعات کا حصّہ ہے جن کا ذکر مصنّف نے مختصراً اپنی کتاب بجنگ آمد کے آخری دو پیروں میں کیا ہے۔ پس منظر کے طور پر مضمون سے پہلے یہ دو پیرے درج کئے جاتے ہیں۔)

## پس منظر

ہمیں مدراس سے پشاور آئے ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا کہ اچانک سیلیکشن بورڈ میرٹھ کے سامنے پیش ہونے کا حکم ملا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو رات کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔۔۔ یہ وہی مبارک دن تھا جب قائد اعظم نے آل انڈیا ریڈیو دلّی سے اعلان کیا تھا کہ تقریباً دو ماہ بعد یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہو جائے گا۔۔۔ میرٹھ سے فارغ ہو کر عازم پشاور ہوئے تو اپنے پرانے دوست ٹانسلائٹس کو ساتھ لیتے ہوئے سیدھے ملٹری ہسپتال پشاور پہنچے۔ دو ہفتے کے بعد ہسپتال سے رخصت ہونے لگے تو انگریز نرس نے (جس نے چوری چھپے ہمارے خط پڑھ پڑھ کر یاد بھی کر لئے تھے)

ہمیں مری میں گرمیاں گزارنے کا مشورہ، حکم اور دھمکی ملا جلا کر دیے اور ڈاکٹر کے کانوں میں ایک ایسی چبھتی سی سرگوشی کی کہ غریب نے فی الفور ہمارے لئے چھٹی کی سفارش کر دی اور خود ہفتہ بھر کان میں گلیسرین ڈلواتا رہا۔

سیسل ہوٹل مری کا کمری نمبر ۲۶ ایک منکسر مزاج سا سنگل کمرہ ہے لیکن ہمارے لئے عظیم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کمرے میں ہم پر ۱۴ اگست کو پاکستان کی پہلی صبح طلوع ہوئی۔ اسی کمرے میں ریڈیو پاکستان کا پہلا نشریہ سُنا۔ گویا اسی کمرے میں وطنِ عزیز کی آزادی کی ابتدا ہوئی۔ مگر اسی کمرے میں ہماری اپنی آزادی کا خاتمہ بھی ہوا۔ یعنی وہ خاتون جو اس شب شریکِ بزم تھی، دوسرے روز شریکِ حیات بن گئی اور وہ آزادہ رو نیم لفٹین جو قاہرہ سے مانڈلے تک عِشق کی دسترس سے محفوظ رہا تھا، مری پہنچ کر اسیرِ اُلفت ہو گیا:

بڑی مدّت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

اور یہاں سے ایک دوسری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

-------------

لیکن اس مضمون سے دوسری داستان کا آغاز نہیں ہو رہا۔ یہ واقعہ بھی اسی داستان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو کتاب میں شامل نہ کیا جاسکا۔ اس واقعہ کی ابتدا ابھی پاکستان بننے سے چند ماہ پہلے ہوئی تو سنیں۔

ہم نے عشق کے معاملے میں ہمیشہ احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔ فقط ایک مرتبہ دِل کھول کر محبّت کی اور آپ نے دیکھا کہ نتیجہ شادی رہا۔ لیکن آپ یہ سُن کر شاید حیران ہوں کہ شادی سے چند ہفتے قبل ہمارے اصلی عشق کے متوازی ایک مِنی عشق بھی چل پڑا۔ بے شک اس میں تھوڑا سا، بالکل تھوڑا سا، دخل ہمارے شوقِ فضول کو بھی تھا لیکن اس کا اصلی محرک ایک دیوی کا پریم تھا جو یوں تو گہری نیند سو رہا تھا، لیکن ہماری چھوٹی سی بدپرہیزی سے بیدار ہو گیا اور ہم اس کی لپیٹ میں آ گئے۔۔۔ کہانی ذرا طویل ہے اور اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب چند ماہ پیشتر ہم مدراس سے براہ دِلّی پشاور آ رہے تھے۔

دلّی میں ایک بڑے صاحب سے ملنا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے ٹھہر گئے۔ صاحب کے دفتر میں گئے تو سیکرٹری نے رستہ روک لیا اور فرمایا کہ صاحب بہادر ایک گھنٹے کے لئے باہر تشریف لے گئے ہیں۔ جی چاہے تو ایک گھنٹہ سیر کر آؤ اور جی چاہے تو اس کونے میں بیٹھ کر انتظار کر لو۔ ہم تھکے ہوئے تھے۔ سیر کا موڈ نہ تھا۔ کونے میں بیٹھ گئے اور سیکرٹری کو دیکھنے لگے۔۔۔ لڑکی تھی!

لڑکی جوان تھی، مگر شکل کی واجبی سی ہی تھی۔ ذرا بجھی بجھی سی لگتی تھی۔ شاید قدر دانی کی کمی کی وجہ سے۔ خدا جانے کیوں مگر ہمیں شرارت سوجھی کہ چلو اس کی تھوڑی سی قدر کریں اور اس کی زندگی میں چھوٹی سی موم بتّی روشن کریں۔ مزید سوچنے سے پہلے ہمارے منہ سے نکلا:

"آپ بنگال کی رہنے والی ہیں؟"

لڑکی چونکی۔ ہمیں کسی قدر غور سے دیکھا اور بولی:

"یہ اندازہ آپ کو کیسے ہوا؟"

"آپ کی آنکھوں سے۔"

"بنگالی آنکھوں کی کوئی پہچان ہوتی ہے؟"

"جی ہاں۔ غزالوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔"

سیکرٹری مسکرائی۔ یوں لگا جیسے خیالی آئینے میں جھانک رہی ہو۔ پھر ہمیں ذرا زیادہ غور سے دیکھا۔ ہم تھوڑے پھولے لیکن آخر بولی تو کہا۔

"میں یو۔ پی کی رہنے والی ہوں۔"

ہمیں اپنے اندازے کی تردید سُن کر سخت مایوسی ہوئی۔ ہم نے دِل میں کہا:

"اے نیک بخت، تو یو۔ پی کی رہنے والی تھی تو جب کیا ہوا؟ ہماری تردید لازم نہ تھی۔ دیکھتی نہیں کہ بھگوان نے ایک چاہنے والا بھیجا ہے۔ بہرحال ہمیں پتہ چل گیا کہ دلبر سخن شناس نہیں۔ گفتگو جاری رکھی اور کہا۔

"ٹھیک ہے یہ غزالی آنکھیں خال خال یو۔پی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً نہرو خاندان میں۔"

بولی: "میں نہرو نہیں، لیکن الہ آباد کی رہنے والی ہوں۔"

ہم نے دِل میں کہا۔ تو نہرو نہیں نہ سہی۔ شکر ہے اللہ کا تو الہ آباد کی باسی تو ہے ورنہ ہماری ساری قیافہ شناسی غارت جارہی تھی۔ پوچھا:

"آپ کا خاندان؟"

"ہم سپرو ہیں۔"

"اچھا خاندان ہے۔ آپ کا نام؟"

ہم انتظار کرنے لگے کہ کوئی پیارا سا نام ہو گا، اوشا، آشا، پدمنی، رکمنی وغیرہ۔

لیکن بولی:

”مجھے مس سپرو کہتے ہیں۔“

کہا: ”اگر دس بارہ مس سپرویں مل جائیں تو پھر آپ کی پہچان کیا ہو گی؟“

بولی: ”میرے بائیں کان پر تیل ہے۔“

محبّت کی کسی دوسری منزل میں تو ہم اس تِل پر جان چھڑک دیتے یعنی سمرقند و بخارا بخشنے کے علاوہ، لیکن اس وقت تِل کی پیشکش ازراہِ محبّت نہیں ہو رہی تھی، بلکہ بغرضِ شناخت۔ ادھر ہم ایک دوست کی حیثیت سے کوائف پوچھ رہے تھے نہ کہ سیکورٹی افسر کے طور پر۔ بہر حال ہمیں خوشی بھی ہوئی کہ معشوق بھولا بھالا ہے۔ پُرکار معشوق انجام کار بہت ثقیل ثابت ہوتے ہیں۔ ہم نے تِل کو مصنوعی غور سے دیکھا اور کہا:

”ہاں سچ مچ بڑا پیارا تِل ہے۔ ویسے آپ کا پورا نام کیا ہے؟“

”مس رادھا سپرو۔“

”مس کے بغیر آپ کا گزارا نہیں ہو سکتا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

اور واقعی وہ سیدھی سی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔ واجبی شکل کے ساتھ اگر عقل بھی واجبی ہو تو رومان تو چلتا رہتا ہے۔ مگر ڈائیلاگ نہیں چلتا۔ ہم نے کہا

''صرف رادھا کتنا پیارا نام ہے۔'' اور صرف پر زور دیا۔

''سب سے پیارا نام تو نرگس ہے۔ میری سہیلی کا نام ہے۔ ہمارے ساتھ ہوسٹل میں رہتی ہے۔''

پیشتر اس کے کہ ہم رادھا پر واضح کرتے کہ سرِ دست ہمیں اس کی بیرونی سہیلیوں اور ان کے اسمائے گرامی میں دلچسپی نہ تھی، بڑے صاحب آ گئے اور ہم ان کے ساتھ ان کے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحب سے فارغ ہو کر سیکرٹری کے کمرے میں آئے تو لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم نے مس سپرو سے پوچھا۔

''یہاں کوئی ریستوران قریب ہے؟''

''امپیریل ریستوران بغل میں ہے۔''

''شکریہ۔ اور ہاں آپ کھانا نہیں کھائیں گی؟''

ہماری دعوت واضح تھی مگر جواب ملا:

''کھاؤں گی مگر ہوسٹل میں لڑکیوں کے ساتھ۔''

ہم نے دِل میں کہا: ”تو ہے ہی اسی قابل۔ تجھے کسی لڑکے کے ساتھ مشکل ہی سے کھانا نصیب ہو گا“۔ اسی اثنا میں ہماری نگاہ اتفاقاً گھڑی پر پڑی تو پوچھنے لگی۔

”کہیں جانا ہے؟“

”جی ہاں اگلی گاڑی سے پشاور جانا ہے۔“

”خاص پشاور؟“

”جی ہاں۔ خاص پشاور۔ آرٹلری میس۔ کمرہ نمبر ۲۔ اور ہاں ڈاک خانہ بھی پشاور ہی ہے۔“

ہمارے جواب پر رادہا مسکرائی۔ ہم سمجھے شاید اب کوئی میٹھی سی یادگار بات کہے گی، لیکن کہنے لگی:

”اچھا؟ پشاور میں تو میری سہیلی کانتی اور اس کا شوہر کیپٹن رمیش رہتے ہیں۔ کیا وہاں جا کر ان کا صحیح پتہ مجھے لکھ سکیں گے؟“

لاحول ولا قوۃ۔ کہاں رومانس کہاں بزنس! بہر حال ہم نے ایک الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

”کوشش کروں گا۔۔۔“ اگرچہ کوشش کی کوئی نیّت نہ تھی۔

اس کے بعد مس رادھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے ہم سے بجھی بجھی نظریں ملائے اپنے ہوسٹل کو چل دی۔ ظاہر تھا کہ رادھا پر ہمارے پیامِ شوق کا کوئی مثبت اثر نہیں ہوا۔ بے شک ہمارے پیام میں بھی بہت نم نہیں تھا، تاہم بظاہر موصوفہ کی مٹی بھی ایسی زرخیز نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے بے چاری کا پیام وصول کرنے والا آلہ ناقص ہے۔ یعنی یا تو پتا ہی نہیں اور یا دھکا سٹارٹ ہے۔ بہر حال ہمارا مدعا بھی ایک عارضی دِل لگی کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی طرح تھوڑا سا فالتو وقت گزارنا تھا۔ وہ گزار لیا، چنانچہ جب مس رادھا کے کمرے سے نکلے تو مس رادھا ہمارے دماغ سے نکل گئی۔

پشاور پہنچے تو تیسرے روز دلّی سے انگریزی زبان میں ایک اجنبی سا خط آیا۔

مضمون تھا:

ڈیئر میجر۔

اگر آپ کو کیپٹن رمیش کا پتہ مل گیا ہو تو مہربانی کر کے لکھ بھیجیں۔ ممنوں ہوں گی۔

آپ کی صادقہ (Yours truely)

آر سپرو

کاروباری ساخط تھا۔ پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ چار دن بعد ایک اور خط آیا۔

ڈیئر فرینڈ۔

اگر آپ کو رمیش کا پتہ نہیں مِلا تو کوئی حرج نہیں۔ آپ اس کا پتہ ملنے تک جواب نہ روکیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ آپ تو خیریت سے ہیں۔

آپ کی مخلصہ (Yours Sincerely)

رادہاسپرو

ارے، کچھ ہو رہا تھا؟ ڈیئر میجر کی جگہ ڈیئر فرینڈ سے خطاب ہونے لگا تھا۔ آر پوری رادھا بن گئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رادھا رانی ہماری خیریت کی خبر کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ ہم نے سوچا خدا نہ بھلائے، یہ نشانیاں تو پیار کی ہیں، لیکن عجیب

سست رفتار پیار ہے۔ ہم نے عشق کی دیا سلائی تو ملاقات کے پہلے لمحے ہی جلا دی تھی۔ لیکن محبّت کی موم بتی اس قدر بعد از وقت روشن ہو رہی ہے۔ کچھ واپڈا مزاج کی لگتی ہے۔ بہر حال ہم ایک دو روز اسی اُدھیڑ بُن میں رہے کہ خط کا جواب دیا جائے یا نہ کہ اتنے میں ایک اور خط آ گیا۔

ڈئیر خان۔

خدا کے لئے مجھے اپنی خیریت کا خط لکھو۔ میں سوچتی ہوں اس روز تم نے امپیریل ریستوران میں کھانے کو کہا تو میں تمہاری دعوت پر اچھل کیوں نہ پڑی۔ (انگریزی محاورہ) میں نے تمہاری ملاقات کا ذکر اپنی سہیلی نرگس سے کیا تو اس نے بتایا کہ پگلی اسے تو تم سے محبّت ہے۔ کاش میں اس وقت سمجھ گئی ہوتی۔ کاش میں تمہیں بتا سکوں کہ میرے دِل میں تم کس قدر گہرے جا چکے ہو۔ (انگریزی محاورہ)

تمہاری اپنی (Your Own)

رارہا

تو ہمارا قیاس درست تھا۔ رادھا کا دِل شارٹ ہونے کے لئے نرگس کے دھکے کا محتاج تھا۔ بہر حال خط پڑھا۔ پھر پڑھا۔ ہم کسی کے دِل میں سما رہے تھے۔ ہمارے یہ نصیب! اب بظاہر تو یہ لوٹنے کی جائے تھی، لیکن لوٹنے کی ہمت نہ پڑی، بلکہ پسینہ آنے لگا۔ ہماری پریشانی اس وجہ سے نہ تھی کہ ایک خاتون نے ہماری دِل لگی کو سچ سمجھ کر ہمارے دِل کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا، بلکہ اس لئے کہ ایک دوسری خاتون۔۔۔ جس کی بدولت اس شاہین کو بالآخر زیرِ دام آنا تھا۔۔۔ ان دنوں ہمارے دِل میں تازہ تازہ گھر کر چکی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر یہ دِل نشین خاتون پوچھ بیٹھی کہ باہر سے دروازہ کون کھٹکھٹا رہا ہے تو ہم کیا جواب دیں گے اور اگر یہ بیرونی شور سے تنگ آکر ہمارا دِل خالی کرنے پر تُل گئی تو ہمارا کیا بنے گا؟ اپنے دِل کی خانہ ویرانی کے تصوّر سے ہم لرز اُٹھے۔ اضطرار میں اور کچھ نہ سوجھا تو اپنے روم میٹ میجر احسان سے مشورہ کرنے لگے۔

احسان نے مشورہ دینے سے پہلے رادھا کے تینوں خط پڑھے۔ ہم سے دلّی کی ملاقات کی روداد سُنی اور اسی توجہ سے جیسے ڈاکٹر مریض کی ہسٹری سنتا ہے، بلکہ اس کی ہمدردی کا یہ عالم تھا کہ ایک ڈاکٹر کی نسبت زیادہ دردمند نظر آرہا تھا۔ یہ وہی احسان تھا جسے میں آج تک ایک بے فکرا اور آوارہ مزاج کا نوجوان سمجھتا تھا، لیکن اس گھڑی صاف رحمت کا فرشتہ نظر آتا تھا۔ کافی سوچ کے بعد پوچھنے لگا:

”یہ دوسری خاتون (جو تمہارے دِل میں گھر کر چکی ہے اس وقت کہاں ہے؟“

”مری میں۔“

”پشاور آنے کا ارادہ رکھتی ہے؟“

”نہیں۔ مجھے مری بلا بھیجا ہے۔“

”تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔ تم دلّی والی کے جواب میں چُپ رہو۔“

”میں نے تمہارے سوا کسی سے بات نہیں کی اور نہ کروں گا۔“

”بات کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف رادہا کے خطوں کے جواب میں خاموش رہو۔ خود بخود چپ ہو جائے گی۔“

کتنا آسان علاج تھا! ”چپ رہو۔ خود بخود چپ ہو جائے گی۔“ کاش خود ہمیں سوجھتا اور رازِ اُلفت عیاں نہ ہوتا۔ لیکن خیر ہمارا راز احسان کے سینے میں بھی اتنا ہی محفوظ تھا۔ اچھا روم میٹ بھی خدا کی دین ہوتی ہے۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ہم نے رادھا کے تیسرے خط کا جواب بھی نہ دیا۔ تین چار دن خیریت کے گزرے۔ ہمارے چہرے پر رونق آنا شروع ہی ہوئی تھی کہ اچانک چوتھا خط آ گیا:

ڈارلنگ۔

میں تمہارے سویٹ خط کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ میں نے اسے پڑھنے سے پہلے کتنی مرتبہ چوما۔ ڈارلنگ، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ جلد بتاؤ کہاں اور کیسے؟

صرف تمہاری(Only Yours)

رادہا

یہ کیا ہو رہا تھا؟ کس کا سویٹ خط؟ دِل مضطر کو تھامے پھر احسان کے پاس گیا اور رادھا کا خط دکھایا۔ پڑھ کر بولا۔

"اونہ۔ ٹھیک ہے۔ خاموشی جاری رکھو۔"

"وہ تو جاری ہے۔ یہ بتاؤ کہ کون ہو سکتا ہے جس نے رادھا کو سویٹ خط لکھا ہے۔"

جواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ احسان ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا ہے جو ہچکی کی شکل میں خارج ہو رہی ہے۔ تو یہ احسان کی کارستانی تھی! اس آوارہ مزاج فرشتے کی! میں نے اپنی محتاجی سے قطع نظر کرتے ہوئے ایک غضب کے عالم میں احسان کے ہاتھ سے خط چھینا اور اسے کہا:

"تو یہ خط تم نے لکھا تھا؟ تم، تم، تم، نے؟ بتاؤ یہ حرکت کیوں کی؟ ظالم دیکھتے نہیں، وہ مری والی خاتون کیا کہے گی؟"

بولا: "مری والی خاتون کچھ بھی نہ کہے گی بشرطیکہ تم یہ خط پلیٹ پر رکھ کر اسے پیش نہ کر دو، بلکہ اب یہ خط میرے پاس ہی رہنے دو۔ پڑھ کر ذرادِل پشاوری کریں گے۔"

"کسی کا خط پڑھنا شرافت سے بعید ہے۔"

"زیرِ بحث معاملہ شرافت نہیں، خط ہے۔ اور چونکہ یہ میرے خط کا جواب ہے۔ اس پر میرا حق نسبتاً فائق ہے۔"

"یہ ناجائز حرکت ہے۔" ہم نے فتوٰی دیا۔

"مگر دلچسپ اور بے ضرر ہے۔ دلّی والی دیوی کا کچھ بھی ضائع نہ ہو گا سوائے رائٹنگ پیڈ کے ایک ورق کے۔ اور ہمارا دِل پشا۔۔۔"

"تمہارا دماغ خراب اور کیریکٹر مشکوک ہے۔ تم رات کو بھی دیر سے آیا کرتے ہو۔"

اس پر احسان کھکھلا کر ہنس دیا اور میں پیچ و تاب کھاتا اٹھ آیا۔۔۔ مگر دو ہی دن گزرے تھے کہ رادھا کی طرف سے ایک برقیہ آیا۔ جی ہاں، خط نہیں تار! مضمون تھا:

دعوت کا شکریہ۔ میں ۷ جون کو ہوائی جہاز سے پشاور پہنچ رہی ہوں۔۔۔

رادہا

فوری اشتعال میں قتل کر دینا کوئی نئی بات نہیں، لیکن فوری طور پر احسان دستیاب نہ ہو سکا۔ اور ہمارا غصّہ احسان کی غائبانہ سرکوبی اور اس کے بیرے سے بالمشافہ تلخ کلامی میں صرف ہو گیا۔ رات گئے احسان ملا تو ہمارے جملہ سنگین ادارے حلیم ہو چکے تھے اور ہمارا غصّہ پارلیمانی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ہم نے تار کھول کر احسان کی میز پر رکھ دیا اور کہا:

"یہ ہے تمہاری دعوت کا جواب۔ اس دفعہ محترمہ نے رائٹنگ پیڈ سے ورق اکھاڑ کر نہیں بھیجا بلکہ خود دلّی سے اُکھڑ کر پشاور آ رہی ہیں۔"

بولا: ”الحمد للہ۔ چشم ماروشن دِل ماشاد۔“

”لیکن دِل ماسخت ناشاد ہے۔ ذرا سوچو تو مری والی خاتون کیا کہے گی؟“

”کچھ بھی نہیں کہے گی۔ بشرطیکہ تم اسے مری سے بلا کر پشاور کے ہوائی اڈے پر رادھا کے استقبال کے لئے نہ لے چلو۔“

”میرا ہوائی اڈّے پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ میں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

”تو مت جاؤ۔ یہ خوشگوار فرض ہم ادا کریں گے۔“

”لیکن وہ میری خاطر آرہی ہے۔“

”ہم تمہاری خاطر ہی اسے لینے جائیں گے۔“

”تم اسے ٹھہراؤ گے کہاں؟ کبھی اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے؟“ ہم نے غصّے سے پوچھا۔

”ارے اس مسئلے کے کئی خوشگوار حل ہیں۔ بستے شہر میں یہ بھی کوئی مسلہ ہے؟“

”اتنا نازک معاملہ ہے اور تمہیں ہر چیز خوشگوار نظر آتی ہے۔ تمہارا دماغ واقعی خراب اور کیریکٹر۔۔۔۔“ ہم وفورِ جذبات سے جملہ بھی پورا نہ کر سکے۔ مگر احسان آرام سے بولا:

”خاکسار کا کیریکٹر مثالی ہے۔ ہماری پچھلے سال کی اے۔ سی۔ آر[11] اٹھا کر دیکھ لو۔“

ہم بڑبڑاتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کریں۔ اگر رادھا آ گئی تو بھرے شہر میں فقط ایک صورت اور ایک ہی گھر پہچان سکے گی اور وہ ہماری صورت اور ہمارا ہی گھر ہے۔ ہمیں رادھا سے عشق نہ سہی، لیکن میری والی خاتون کو اپنے عدم عشق کا کیا ثبوت دیں گے؟ اور اگر اس نے ہم سے منہ موڑ لیا تو ہم یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گے؟ ہم رونے پر آ گئے اور مایوسی کے عالم میں ہم نے نیچے سروں میں خدا سے شکوہ کیا؟

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں

ہیں تلخ بہت بندۂ مجبور کے اوقات

(جی ہاں۔ ہم نے جان بوجھ کر مزدور کو مجبور سے بدل ڈالا۔ بے شک ہمارا بُرا حال تھا مگر میجر تھے!)

پھر خدا سے باقاعدہ دعُا مانگی جس میں اپنی مجبوری کا تفصیل سے ذکر کیا۔

---

[11] سالانہ خفیہ رپورٹ جو ہر فوجی افسر کے متعلق تھی جاتی ہے۔

”اے رب۔ جس خاتون سے ہمیں محبّت نہیں اسے دھوکہ نہیں دینا چاہتے اور جس سے محبّت ہے اسے کھونا نہیں چاہتے کہ یہی صالح عاشقوں کا شیوہ ہے لیکن خدایا، جذبۂ دِل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے کہ اسے کھو رہے ہیں جسے پانا چاہتے ہیں اور وائسی ورسا (VICE VERSA) لاطینی معاف، میرے خدا تو سب زبانوں پر قادر ہے اور دلوں کا حال جانتا ہے۔ کیا تیری رحمت سے بعید ہے کہ تیرے مجبور بندے کی بن جائے۔“

دُعا کا مُنہ سے نکلنا تھا کہ افلاک سے نالوں کا جواب آ گیا۔ معاً ہمیں یاد آیا کہ ہم چند روز میں سلیکشن بورڈ کے سامنے میرٹھ جانے والے ہیں۔ ہم نے فوراً رادھا کو اپنے ہاتھ سے تار بھیجا:

”میں ۳ جون کو میرٹھ آ رہا ہوں۔ وہاں سے فارغ ہو کر تمہیں دلّی آ کر ملوں گا۔ میرا وہیں انتظار کرو۔۔۔خان۔“

تار بھیج چُکا تو یکلخت بادل چھٹ گئے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اپنی دعُا کو شاباش دی جو اس پھرتی سے قبول ہوئی تھی۔ ۳ جون کو قائداعظم کی ریڈیائی تقریر سُننے کے بعد عازمِ میرٹھ ہوئے تو ہم دوہری خوشی سے چمک رہے تھے۔ اور خدا تعالیٰ نے دنیائے محبّت میں حصولِ مراد کی بشارت دی تھی۔ اور دنیائے سیاست میں قائداعظم نے قیامِ پاکستان کا مژدہ سنایا تھا۔ ہم کامیاب محبّت اور آزاد وطن کا جشن مناتے ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ احسان ہمیں رخصت کرنے آیا۔ خداحافظ کرتے ہوئے کہنے لگا:

”ہاں تو رادھا کا فکر نہ کرنا۔ میں نے اس کے تار کا مناسب جواب دے دیا ہے۔“

”مناسب جواب؟ مثلاً؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”یہی کہ تمہارے آنے کی خبر سُن کر دِل باغ باغ ہو گیا ہے۔ ہوائی اڈّے پر تمہارا انتظار کروں گا۔“

چلتی گاڑی سے غصّے کا عملی اظہار چھلانگ لگائے بغیر ممکن نہیں، لیکن میجر اور کپتان سرِعام چھلانگیں نہیں لگایا کرتے؟ چنانچہ ہم نے چھلانگ روک کر اپنے افسرانہ وقار پر تو آنچ نہ آنے دی مگر میجر اسلم پر واضح کر دیا کہ میرٹھ سے واپسی پر ہمارا پہلا کام اس کا کام تمام کرنا ہو گا۔ پھر اپنی نشست پر بیٹھے تو سارے راہ آتشِ غضب سے پورے وقار کے ساتھ دہکتے رہے۔ بٹھنڈے کے قریب ہمارے درجۂ حرارت میں ذرا افاقہ ہوا تو سوچنے لگے۔ کاش یہ جعلی عشق نہ کرتے۔ کہیں یہ ہمارے حقیقی عشق کو بھی نہ لے ڈوبے۔

میرٹھ میں امتحان دیتے وقت بھی غمِ عشق دامن گیر رہا۔ ممتحن کرنل سوال پوچھتے تو منہ سے جواب بعد میں نکلتا اور سینۂ سوزاں سے آہ پہلے بر آمد ہوتی۔ یہ کہنا تو شاید مبالغہ ہو گا کہ میری آہِ آتشیں سے بالِ کرنل جل گیا، لیکن ہمارا گلا ضرور بھڑک اُٹھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ڈاکٹر نے دیکھا تو غیر عاشقانہ سی زبان میں کہنے لگا:

"ٹانسلائٹس ہو گیا ہے۔ اور حکم دیا کہ پشاور پہنچتے ہی ہسپتال میں رپورٹ کرو۔"

پشاور پہنچے تو ایک تو گلے کے درد سے بے حال ہو رہے تھے۔ دوسرے اس خیال سے کہ آگے رادھارانی احسان کی نگرانی میں انتظار کر رہی ہو گی، دِل کا درد بھی شاملِ حال ہو گیا، لیکن کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ رادھا کی بجائے رادھا کا خط انتظار کر رہا ہے۔ احسان کہیں ایکسر سائز پر قبائلی علاقے میں چلا گیا تھا۔ رادھا کا خط کھولا۔ لکھا تھا:

ڈارلنگ۔

تمہارے دونوں تاروں کا مضمون الگ الگ ہے۔ تم کہاں ہو؟ میں دلّی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔

تمہاری اپنی رادھا۔(Your Own)

ہم نے دِل میں کہا: 'ہماری اپنی رادھا۔ اللہ تمہاری عمر اور تمہارا دلّی کا قیام دراز کرے۔ دلّی جیسی شاہی بستی میں رہ کر انتظار کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ صرف پشاور آنے سے پرہیز کرنا۔ خدا نے چاہا تو زود یا بدیر تمہیں گھر کے قریب ہی کوئی چاہنے والا مل

جائے گا۔ آخر بڑے صاحب کو ملنے والے ہم جیسے ہزاروں آتے رہیں گے اور تکنیک تو اب تم کو معلوم ہی ہے: "اچھا تو آپ پنڈی / پشاور / کابل جا رہے ہیں۔ وہاں تو میری سہیلی کانتی اور اس کا خاوند کیپٹن رمیش رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔"

ہم نے اس خط کے جواب میں خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

ہمیں مری سے سے بھی لگاتار خط آ رہے تھے۔ وہی خط جن کے چوری مطالعہ کے بعد ہماری خُدا ترس نرس پر رقّت طاری ہو گئی تھی اور موصوفہ نے ہماری خاطر سٹاف سرجن کے کان میں ایسی زود اثر سرگوشی کی تھی کہ ہمیں ہسپتال سے چھٹی دِلا کر سیدھا مری بھیج دیا تھا۔

مری پہنچے تو پیچھے پیچھے رادھا کے خطوط بھی براہ پشاور مری پہنچتے رہے۔ وہی پرانا مضمون تھا: اب اور نہ تڑپاؤ یا ہم کو بلا بھیجو یا آپ چلے آؤ۔ ہم خط پڑھتے۔ رادھا کے لئے ذرا دِل پسیجنے لگتا لیکن میری والی کو دیکھتے تو دِل دوسری طرف پسیجنا شروع کر دیتا۔ چنانچہ ہم دِل کو سمجھا بجھا کر خط ایک طرف رکھ دیتے کہ اسی میں رادھا کا، ہمارا اور جملہ عوام النّاس کا بھلا تھا۔ آخری خط ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آیا۔ لکھا تھا:

"ڈارلنگ

میں تمہارے خط کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب تو پاکستان بن چکا ہے۔ ہوائی جہازوں کی آمدورفت بھی بند ہو گئی ہے۔ اب تو تم میرے لئے خواب ہوتے جارہے ہو۔"

اس خط سے دو روز پہلے مری والی خاتون شریکِ حیات بن چکی تھی۔ اسے رادھا کا خط دکھایا اور شانِ نزول بیان کی۔ اسی دن ولیمہ میں عورتوں کے حلقے میں بحث چھڑ گئی کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو کیا کیا فائدے ہوئے ہیں۔ جب دوسری خواتین رائے دے چکیں تو ایک نئی نویلی دلہن نے شرماتے ہوئے کہا:

"ایک ہی فائدہ ہوا ہے۔ دلّی اور پشاور کے درمیان ہوائی سروس بند ہو گئی ہے۔"

# نہ خدا ہی ملا۔۔۔

شاعر، جو افسر بھی ہے۔ اپنے دفتر کی میز پر بیٹھے کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کا پی۔ اے ملحقہ کمرے میں فون سن رہا ہے)

پی۔ اے: (فون پر اپنے صاحب کو) ”سر آپ کے لئے ٹیلیفون ہے۔“

شاعر: ”کس کا ہے؟“

پی۔ اے: ”آرزو شاہ پوری کا ہے۔“

شاعر: ”آرزو؟ یہ مرد ہے یا عورت؟“

پی۔ اے: ”مرد ہے حضور۔ آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہے۔“

شاعر: ”ارے میاں کہہ دو صاحب دفتر میں نہیں یا کوئی اور بہانہ کر دو میں ایک اہم فائل دیکھ رہا ہوں۔“

پی۔اے: ”بہت اچھا حضور“ (پی۔اے آرزو شاہ پوری کو بآوازِ بلند ٹرخاتا ہے۔ شاعر پی اے کے ٹرخانے کے انداز سے محظوظ اور مطمئن ہوتا ہے)

(شاعر معروف ضرور ہے مگر فائل میں نہیں شاعری میں! قلم ہاتھ میں لینے کی بجائے دانتوں میں دبائے آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا ہے۔ ادھر پی۔اے کے کمرے سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی کسی کو ٹرخانے کے لئے پی۔اے کے کلمات گونجتے ہیں۔ شاعر کو تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اب کس نے فون کیا ہے۔ پی۔ اے سے پوچھتا ہے)

شاعر: ”کسی کا فون تھا؟“

پی۔اے: ”بیگم صاحبہ تھیں۔“

شاعر: ”شاباش۔ کیا کہا تھا؟“

پی۔اے: ”میں نے کہا تھا صاحب میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں۔“

شاعر: ”بالکل ٹھیک۔ ان سے مصروفیت کا بہانہ بھی نہ کرنا۔“

پی۔اے: ”میں جانتا ہوں صاحب۔ مصروفیت کا بہانہ سُن کر شاید وہ آپ سے زیادہ مجھے صلوٰاتیں سناتیں۔“

شاعر: ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بہت باتیں نہیں کرتے۔“

شاعر بدستور سوچ رہا ہے اور پی۔ اے کے ٹیلیفون کی پھر گھنٹی بجتی ہے۔

پی۔ اے حسبِ معمول فون کرنے والے کو ٹال دیتا ہے۔ شاعر کسی قدر لاپروائی سے پوچھتا ہے۔

شاعر: ”اس دفعہ کون تھا؟“

پی۔ اے: ”کوئی یاسمین تھی۔“

شاعر: (یک لخت چونکتے ہوئے) ”یاسمین تھی۔“

پی۔ اے: ”جناب۔“

شاعر: ”تو نالائق بتایا کیوں نہیں؟“

پی۔ اے: ”حضور آپ کی ہدایات کی رُو سے آپ تو دفتر میں ہی نہیں۔“

شاعر: ”دیکھو میاں پی۔ اے۔ اِدھر آؤ اور غور سے سُنو۔ بے شک ہم مصروف ہیں بلکہ یہاں موجود ہی نہیں، لیکن زندگی میں ہر قاعدے کی مستثنیات بھی ہوتی ہیں۔“

پی۔اے:"میں معافی چاہتا ہوں۔اگر زحمت نہ سمجھیں تو مجھے مستثنیات کے نام لکھ دیں۔"

شاعر:"نام لکھانے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ ٹیلیفون آئے تو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھ لیا کرو۔"

پی۔اے:"بہت اچھا حضور۔"

(ایک وقفے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔شاعر پوچھتا ہے)

شاعر:"اب کے کون ہے؟"

پی۔اے:"شمشیر حیدر آبادی ہے۔"

شاعر:"ٹرخادو۔ٹرخادو۔"

پی۔اے شمشیر حیدر آبادی کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ پھر ایک مزید وقفے کے بعد گھنٹی بجتی ہے۔پی۔اے ٹیلیفون کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاعر کو بتاتا ہے)

پی۔اے:"سر کوئی خاتون ہے مگر نام نہیں بتاتی۔"

شاعر:"بےوقوف خواتین سے نام نہیں پوچھا کرتے۔لاؤ ٹیلیفون میری طرف کرو۔"

پی۔اے:”یہ لیجئے بات کریں۔“

شاعر:”ہیلو۔“

زنانہ آواز:”ہیلو۔“

شاعر:”کون صاحبہ ہیں؟“

زنانہ آواز:”نہیں پہچانا مجھے؟میں ثمینہ ہوں۔“

شاعر:”اوہیلو ثمینہ۔کتنی بڑی عمر ہے تمہاری!میں تمہارے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔“

ثمینہ:”کیا سوچ رہے تھے؟“

شاعر:”یہ کہ کتنی خوبصورت، کتنی پیاری۔۔۔کتنی ایں۔۔۔ایں۔۔۔میرا مطلب ہے کتنی اچھی ہو تم۔“

ثمینہ:”بس صرف اچھی ہوں؟اور کچھ نہیں؟“

شاعر:”بھئی کیوں قصیدہ کہلواتی ہو۔ویسے اس وقت ایک غزل ہی لکھ رہا ہوں تم پر!“

ثمینہ:”مجھ پر؟غزل؟ذرا مطلع تو سناؤ۔“

شاعر:”م۔م مطلع تو ابھی مکمل نہیں ہوا۔اگلا شعر سُن لو۔“

ثمینہ:(شوق سے)"سناؤ۔"

شاعر:

شام آئی تو شفق کی صورت

تیرے عارض تیرے گیسو چمکے

ثمینہ:"یہ شعر تو میں نے پہلے بھی سنا ہے۔"

شاعر:"کس سے؟"

ثمینہ:"یاسمین سے۔"

شاعر:"یاسمین سے؟"

ثمینہ:"ہاں ہاں۔وہ کہتی تھی ایک خوشامدی شاعر نے مجھ پر لکھا ہے۔"

شاعر:"کوئی اور شعر ہو گا اور شاعر بھی کوئی اور ہو گا۔میں یاسمین جیسی لڑکی پر اپنا شعر ضائع نہیں کر سکتا۔"

ثمینہ:"آپ جانتے ہیں یاسمین کو؟"

شاعر: ”جانتا تو نہیں، دیکھی بھی ضرور ہے۔ اسے شاعرہ ہونے کا مغالطہ ہے۔ ایک روز اصلاح کے لئے آئی تھی۔“

ثمینہ: ”پھر دی اصلاح؟“

شاعر: ”توبہ کرو اسے تو وزن کا ہی شعور نہیں۔ پھر اس کی شکل بھی وزن سے باہر ہے۔“

ثمینہ: ”اتنی بد صورت تو نہیں وہ۔“

شاعر: ”مگر وہ ثمینہ بھی تو نہیں۔ معلوم ہے تم کتنی خوبصورت ہو؟“

ثمینہ: ”چھوڑیئے بھی۔ اچھا دیکھیں۔ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو میں آپ کے دفتر آ جاؤں؟“

شاعر: ”ضرور۔ وہ کیا کہا ہے غالب نے۔ ہزار بار برو۔ صد ہزار بیا!“

(ثمینہ داخل ہوتی ہے۔ شاعر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک مسرّت کے عالم میں کہتا، بلکہ گاتا ہے)

شاعر: ”وہ آئیں گھر میں ہمارے۔ آیئے آیئے کہاں بیٹھو گے؟“

ثمینہ: ”کرسی پر بیٹھوں گی اور کہاں بٹھائیں گے؟“

شاعر: ”ہم تو چاہتے ہیں تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں۔“

(ثمینہ اس فوری بے تکلّفی پر ابرو اٹھاتی ہے۔ شاعر پانسا بدلتا ہے)

شاعر: ”بھئی محاورہ کہہ رہے تھے۔“ (مسکرا دیتا ہے)

ثمینہ: ”میرا خیال ہے محاورے کی نسبت کرسی زیادہ آرام دہ رہے گی۔“

شاعر: ”یہ تمہارا خیال ہے مگر جیسی تمہاری مرضی۔ بیٹھو۔“

ثمینہ: ”ہاں تو آپ کہہ رہے تھے آپ نے ایک غزل لکھی ہے۔“

شاعر: ”ایک غزل نہیں ایک خاص غزل! صرف تمہارے لئے!“

ثمینہ: ”زہے نصیب۔ ارشاد۔“

شاعر: ”مطلع عرض کیا ہے۔“

جب تری یاد کے جگنو چمکے

کتنے مہتاب لبِ جُو چمکے

ثمینہ: ”یہ سب میری یاد کا نتیجہ ہے؟“

شاعر: ”جی ہاں۔ آپ کی یاد کا۔“

ثمینہ: ”مجھے آپ مت کہیں۔ میں آپ سے پندرہ برس چھوٹی ہوں“۔

شاعر: ”گویا میں بوڑھا ہوں؟“

ثمینہ: ”نہیں، میرا یہ مطلب نہ تھا۔ ویسے آپ کے سر پر چند اور بال ہوتے تو آپ بالکل اکیس برس کے لگتے۔“

شاعر: (سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ”ہاں میرا سر ذرا زیادہ فارغ البال اور معمر لگتا ہے۔“

ثمینہ: ”چھوڑیئے ان باتوں کو خواہ مخواہ رومان توڑ دیتے ہیں۔“

شاعر: ”واہ وا۔ کیا دِل کی بات کہی ہے! بے شک تمہاری موجودگی سراسر رومان ہے۔“

ثمینہ: ”اب اگلا شعر بھی تو سنائیں۔“

شاعر: ”ضرور ضرور عرض کیا ہے۔“

تیری آواز سے خوشبو پھیلی

تیری آہٹ سے گلستاں چمکے

ثمینہ: ”بہت خوب مگر اور تو کسی نے آج تک نہیں کہا کہ میری آواز آتی خوشبو دار ہے“۔

شاعر: ”بھئی اور لوگ بد ذوق ہیں۔ حسینوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے شاعر کی ناک چاہیے اور یہ خاکسار پیدائشی شاعر ہے۔“

ثمینہ: ”مانتے ہیں۔مانتے ہیں۔ آگے کیا لکھا ہے۔“

ہم نے اس وقت دھنک کو دیکھا

جب فضا میں ترے بازو چمکے

(ثمینہ جھٹ اپنے عریاں بازو کو اٹھا کر دیکھتی ہے اور مطمئن ہو کر کہتی ہے)

ثمینہ: ”مکرر مکرر۔“

(شاعر خوش ہو کر ثمینہ کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر اس کا دھنک رنگ بازو اور بلند کرتا ہے اور اس طرح رومان کو عروج پر پہنچا کر شعر دہرانا ہی چاہتا ہے کہ دروازے سے یاسمین داخل ہوتی ہے۔ یہ غیر متوقع دخول رومان کا ستیاناس تو کر ہی دیتا ہے۔ شاعر کی زبان کو بھی لڑکھڑا دیتا ہے۔ شاعر کے منہ سے بمشکل نکلتا ہے)

شاعر: ”یہ، یہ، یاسمین تم۔“

یاسمین: ”جی ہاں میں، مگر شاعر صاحب اپنی کپکپی پر قابو پانے اور محترمہ کی فرمائش پوری کیجئے۔ شعر مکرر عطا فرمایئے۔“

شاعر: ”ک۔ک۔ک۔کون ساش ش شعر؟“

یاسمین: ”چلیں آپ کپکپا لیجئے۔ شعر میں دہرا دیتی ہوں۔“

(یاسمین ترنّم سے شعر الاپتی ہے)

ہم نے اس وقت دھنک کو دیکھا

جب فضا میں ترے بازو چمکے

(ثمینہ یاسمین کے منہ سے وہی شعر سُن کر حیران ہوتی ہے اور شاعر سے پوچھتی ہے)

ثمینہ: ”شاعر صاحب۔ یہ شعر یاسمین تک کیسے پہنچا؟“

یاسمین: ”ثمینہ بی بی۔ کل انہوں نے میرا بازو اُٹھا کر اسی طرح یہ شعر مجھ تک پہنچایا تھا، بلکہ پوری غزل پہنچائی تھی۔ ٹھیک کہتی ہوں نا شاعر صاحب؟“

(شاعر بدستور کپکپی میں مبتلا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ کیسے ان دو لڑکیوں کے ساتھ نپٹے۔ مگر اسی لمحہ ایک تیسری بی بی اندر داخل ہوتی ہے۔ یہ شاعر کی بیگم ہے۔ بیگم کو

دیکھ کر شاعر کی کپکپی بے تحاشا آٹومیٹک ہو جاتی ہے۔ ثمینہ اور یاسمین فرنیچر سے ٹکراتے ہوئے باہر نکل جاتی ہیں۔ بیگم ایک لمحے کے لئے شوہر کی شکل کا جائزہ لیتی ہے اور غصّے سے زیادہ رحم کھاکر کہتی ہے)

بیوی: ”تم سے لڑنا فضول ہے مگر ایک بات، اب گھر کا رخ نہ کرنا۔ سن لیا؟ گھر مت آنا۔“

(بیوی آخری تین الفاظ پیس پیس کر ادا کرتی ہے اور آرام سے دروازہ بند کر کے باہر چلی جاتی ہے)

## شاخسانہ

جناب شاعر اب ایک ریسٹ ہاوس میں رہتے ہیں۔ جہاں کوئی بیوی ہے نہ محبوبہ۔ فقط ایک بوڑھا چوکیدار ہے۔ چوکیدار کا کہنا ہے کہ جناب شاعر بڑے آزردہ ہیں۔ کچھ لکھتے پڑھتے نہیں۔ بس ایک شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ چوکیدار کو پورا شعر تو یاد نہیں مگر کہتا ہے اس کے پہلے چند الفاظ کچھ اس طرح ہیں:

نہ خدا ہی ملا نہ۔۔۔۔۔۔

# یہ بڑے لوگ

کبھی آپ نے غور فرمایا کہ عہدہ بڑھنے کے ساتھ ایک عام پاکستانی میں کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟ سب سے پہلے تو اسے دوسری شادی کی سوجھتی ہے۔ اچانک اس پر منکشف ہوتا ہے کہ وہ جو ایک مدّت سے رفیقۂ حیات چلی آرہی تھی، یک لخت رفاقت کے قابل نہیں رہی۔ بے چاری کی وضع کی سادگی جناب کے مشاغل کی رنگینی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اب وہ ایک بیوی کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے جو پروردگارِ حُسن ہو اور پیغمبرِ جمال۔ اور کوئی ایسی جنس نظر آجائے تو مزید جستجو میں رہتا ہے کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

شروع شروع میں تو ایسی یزواں شکار بیویاں فرنگ سے آتی تھیں لیکن بعد میں کچھ دِنوں کے لئے بناتِ عرب و دُخترانِ عجم کی درآمد بھی فیشن بن گیا کہ اس طرح ایک اچھی خاصی میم بھی حبالۂ عقد میں آجاتی تھی اور اسلامی اخوّت کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا تھا۔ یعنی خاصا رنگین ثوابِ دارین حاصل ہو جاتا تھا، لیکن بحمد اللہ اب پاکستان ماڈرن بیویوں میں خاصی حد تک خود کفیل ہو گیا ہے، لہٰذا اب نئے عہدے کے اعلان ہونے

کے ساتھ ہی ایک نئی بیوی کی پاکستان گیر تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ تلاش اس لئے کہ ہر پاکستانی لڑکی بڑے صاحب کی دلہن بننے کی اہل نہیں۔ اس مرتبے پر فائز ہونے کے لئے۔۔۔ سپیریر سروسز کی شرائط کی طرح۔۔۔ چند کوالیفکیشنز کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ رنگ گورا ہو۔ کسی سانولے رنگ کی لڑکی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اوّل درجے کے افسر کے ساتھ شادی کا خیال دِل میں لائے۔ یہ قواعد کی رو سے غلط اور آداب کی رو سے گستانی ہے۔

گورا رنگ اس لئے لازم ہے کہ میم نہ سہی، میم کا دھوکہ ہوتا رہے۔ نیز چونکہ دھوکہ اس صورت میں کھایا جا سکتا ہے کہ گورا رنگ مستور نہ ہو لہٰذا دوسری لازمی شرط یہ ہے کہ پردہ نہ کرتی ہو۔ لیکن یہ جزوی اور جامد سی بے پردگی نہیں جو برقع ترک کرنے سے پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ وہ فعال بے پردگی ہے جس میں دوپٹہ اور آستینیں کم ہوتے ہوتے غائب ہو جاتی ہیں اور باقی ماندہ پیرہن کی تنگی اور تنگی خطوط بدن کی اس وضاحت سے غمّازی کرتی ہیں کہ تماشائی کو تصوّر پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سر کے بال دراز ہوں یا کوتاہ، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ایسے نہ ہوں جیسے خدا نے لگا کر بھیجے تھے۔ بلکہ قدرت کی تمام غلطیوں کی کمی چابکدست مشاطہ (مشاط ہو تو بہتر ہے) نے مو بمو اصلاح کی ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ دلہن سوشل (SOCIAL) ہو۔ سوشل ہونا بڑی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں مخلوط کھانوں اور کھیلوں میں شامل ہونے سے لے کر ناچنے تک سب کچھ آتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ اگر کچھ باقی رہ جاتا ہے تو برائے نام ہی رہ جاتا ہے۔ اور آخر میں متوقع بیوی کو انگریزی بولنا اور موٹر چلانا بھی آتا ہو تو دیگر شرائط کو ذرا نرم بھی کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اگر موٹر جہیز میں لائی گئی ہو۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ دوسری تبدیلی یہ آتی ہے کہ جنابِ عالی انسان سے صاحب بن جاتے ہیں۔ انہیں کوئی شیخ یا میاں کے لقب سے پکارے تو اس طرف دیکھتے ہی نہیں۔ صرف زیرِ لب بلانے والے کے حق میں کچھ بدزبانی کر دیتے ہیں۔ لیکن کوئی خدا کا بندہ انہیں صاحب سے مخاطب کر دے تو اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ پھر کب صاحب کہہ کر پکارے گا۔ جب نوکر کو دھوبی سے یہ کہتے سنتے ہیں کہ نالائق آدمی، تم نے صاحب کا سوٹ خراب کر دیا تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ خواہ سوٹ کا واقعی ستیاناس ہو گیا ہو۔ اگر بیرا کسی ملنے والے سے کہہ دے کہ صاحب سو رہے ہیں تو یہ قیامت تک سوئے رہیں گے کہ ان کی صاحبی کا تذکرہ جاری رہے۔

لیکن جہاں دوسروں کے لئے یہ صاحب بہادر اور بیگم صاحب ہیں، خود آپس میں ایک دوسرے کو خاصے لغو اور بے معنی ناموں سے پکارتے ہیں۔ کوشش حتیٰ الوسع یہ ہوتی ہے کہ یہ نیک نام انگریزی نما ہوں۔ مثلاً صاحب کا نام جمیل ہے تو بیگم جمی بلائیں گی اور

بیگم صاحبہ شادی سے پہلے شمیم تھیں تو اب شیمی کہلاتی ہیں۔ میاں بیوی بالاتّفاق اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ ان ننھے مُنّے ناموں سے پکارنا ماڈرن ہونے کی علامت ہے۔ ثبوت یہ کہ انگریز اور تمام بڑے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ نیز ان ناموں سے بلانے سے باہمی پیار بڑھتا ہے، چنانچہ آپس میں لڑائی ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے نام نہایت سنوار کر بُلاتے ہیں اور معاملہ زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اسے مسٹر کہے گی اور یہ اُسے محترمہ سے خطاب کریں گے۔ ناراضگی بڑھ جائے تو اب وہ پہلی بیوی والی بات نہیں کہ جب تک آپ راضی نہ ہوں گے اور کھانا نہ کھائیں گے، میں روٹی کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ اب تو ابتدائی گالی گلوچ کے بعد بیگم صاحب سینما کو چل دیتی ہیں اور صاحب کلب کی راہ لیتے ہیں اور اس وقت تک باہم راضی نہیں ہوتے جب تک بیرے، خانسامے اور جملہ ہمسائے ان کی خانہ جنگی سے تنگ آکر صلح نہ کرا دیں۔ وہ شرفا بھی کوئی شرفا تھے جن کی گھر کی بات حویلی سے باہر نہ جاتی تھی؟ بیچارے اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔

یہ گھر کے اندر اور باہر کی تمیز بھی اگلے وقتوں کی بات ہے۔ وہ چھوٹے آدمی ہوتے تھے جن کے گھر کے دو واضح حصّے ہوتے تھے۔ سامنے صحن اور بیٹھک یعنی مردانہ اور پیچھے زنانہ۔ لیکن صاحب بنتے ہی زنانہ حصّہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ اب اس طرف فرصت کے وقت نوکر لوگ بیٹھ کر صاحب کی ”کوئی ہے“ کا انتظار کرتے ہیں۔ مردانہ میں اب زنانہ التفات کی بدولت ہر وقت رونق رہتی ہے۔ بیٹھک وہی ہے مگر اب گول کمرہ کہلاتی ہے اور کسی زمانے میں اگرچہ مردوں کے لئے مخصوص تھی مگر اب اس کے استعمال میں

تذکیر و تانیت کی تمیز نہیں، بلکہ اپنے اور غیر کا امتیاز بھی نہیں رہا۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

عہدہ بڑھنے کے ساتھ صاحب کے فرائض میں اضافہ ہونا چاہیے لیکن ہوتا نہیں۔ البتّہ صاحب کے آرام کے اوقات میں نمایاں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اس آرام میں صبح کی بیداری اب عذاب معلوم ہوتی ہے چناچہ جب تک خدّام ادب دس بارہ دفعہ یاد نہ دلائیں کہ آج جمعہ نہیں، آپ اس وقت تک نہیں اٹھتے اور اٹھیں بھی تو پورے اٹھتے کہاں ہیں۔ پہلے تو ذرا نیم دراز ہو کر بستر ہی میں مارننگ ٹی پیتے ہیں۔ غسل خانے میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت تک خارج نہیں ہوتے جب تک بیگم صاحبہ بزور بر آمد نہ کریں کہ ناشتہ کے لیے ایک معینہ مدّت سے زیادہ وہ بھی انتظار نہیں کر سکتیں۔

پھر جناب دفتر میں جاتے ہیں۔ بہت دیر سے جاتے ہیں اور قصداً کہ صحیح وقت پر دفتر پہنچنا ہتک سمجھتے ہیں، پابندئ وقت ان کی شان نہیں، کلرک کی پہچان ہے اور جب دفتر کے دروازے کے قریب پہنچتے ہیں تو اندر داخل ہونے سے پہلے ایک عمل لازم ولابدی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی چپڑاسی، اور چپڑاسی نہیں تو کوئی جن یا بشر دروازے کی چِق اُٹھائے تا کہ صاحب اندر قدم رکھ سکیں۔ اگر سچ مچ صاحب کو اپنے ہاتھ سے چِق اُٹھانا پڑ گئی تو دفتر میں قیامت آ جائے گی اور چند نچلے درجے کے پاکستانیوں کا روزگار خطرے میں پڑ

جائے گا لیکن پاکستانی چپڑاسی کہ اپنے صاحبان کی مزاج شناسی کے سپیشلسٹ ہیں بروقت چِق اٹھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ اس لیے ملک کا کاروبار چل رہا ہے۔

اب دفتر کا کام شروع ہوتا ہے۔ صاحب بہادر پہلے تو وہ نوٹ بک کھولتے ہیں جس میں گھر سے چند اہم گھریلو پوائنٹ لکھ کر لائے ہیں۔ ان پوائنٹس کی نوعیت کچھ اس قسم کی ہے۔

۱۔ رحمان اینڈ سنز کو فون کرنا کہ بیگم صاحبہ کو لِپ اسٹک پسند نہیں، ذرا گہرے شیڈ کی بھیجو۔

۲۔ پلازا سینما پر آخری شو کے لیے دو فری پاسوں کا انتظام

۳۔ مری جانے کے لیے چھٹی کی درخواست لیکن ہو سکے تو ڈیوٹی بناؤ۔

۴۔ شمی کے میکے والوں کو خط اور مری آنے کی دعوت۔

۵۔ وغیرہ وغیرہ

یہ اہم کام کے بعد دیگرے ہونے شروع ہوتے ہیں۔ صاحب کے قریب فائلوں کا انبار لگ رہا ہے۔ جب آخری گھریلو پوائنٹ پر ٹک لگ جاتی ہے تو صاحب دِل کڑا کر کے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے، لیکن اسی لمحے اچانک کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے

اور ایک اور ہنستا گنگناتا صاحب اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ جو فائل کی طرف بڑھ رہا تھا، مہمان کے مصافحہ کو بڑھتا ہے۔ تخلیہ ہو جاتا ہے اور سرکاری کام دھک سے رُک جاتا ہے۔ چائے آ جاتی ہے، قہقہے لگتے ہیں، سگریٹ جلتے ہیں، گپیں چلتی ہیں، موضوع ایک تیسرا صاحب اور اس کی بیگم ہے۔۔۔

کلرک بے چارہ ہر پانچ دس منٹ کے بعد جھانکتا ہے لیکن صاحبانہ قہقہے اسے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ خدا خدا کر کے مہمان رخصت ہوتا ہے تو کلرک فائلوں کا پلندہ صاحب کے قریب سرکا دیتا ہے لیکن عین اسی لمحے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ یہ بیگم صاحبہ کا فون ہے۔ کچھ اس طرح کی گفتگو ظہور میں آتی ہے۔

"تم ہو جمی؟"

"ہیلو شیمی۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"اچھا؟ ابھی آتا ہوں۔ ذرا یہ فائل۔"

"فائل جائے بھاڑ میں۔"

"ضرور جائے۔"

اور صاحب نوٹ بُک اُٹھائے موٹر کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔ رہیں فائلیں تو وہ ایک مدّت سے جمع ہو رہی ہیں۔ ہوتی رہیں۔ کوئی نئی بات نہیں۔ کارِ جہاں اگر اتنا ہی دراز ہے تو صاحب کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

# ریٹائرمنٹ کا ذائقہ

جانشینِ من، آپ نے پوچھا ہے ریٹائرمنٹ کا ذائقہ کیسا ہے؟ ذائقہ کچھ کھٹ مٹھا سا ہے۔ مٹھاس میں تو کچھ شک نہیں لیکن کھٹاس سے بھی انکار مشکل ہے۔

پہلے کھٹاس کی سنیئے۔ ریٹائرمنٹ کا پہلا جھٹکا ہمیں اس وقت لگا جب پتہ چلا کہ الہ دین کا چراغ کھو گیا ہے۔ آپ شاید نہ سمجھے ہوں۔ اگر آپ اسی میز پر بیٹھتے ہیں جس پر میں بیٹھا کرتا تھا تو چراغ اسی میز کے دائیں کونے میں پائیں گے۔ اس چراغ سے کام لینے کے لیے اسے رگڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ فقط اس پر انگلی رکھنے سے ہی جن نمودار ہوتا تھا بلکہ ایک نہیں تین چار جن! میرے وقت میں سب سے بڑے جن کا نام گلاب خان تھا۔ گلاب خان[۱۲] بھی کیا حاجت روا جن تھا۔ حرفِ سوال لب تک آیا نہیں اور اس جن نے مراد پوری کر دی۔ میں نے کبھی اسے کوہ قاف کی پریوں کی شہزادی لانے کو نہ کہا ورنہ بالیقین یہ اسے بھی ورغلا لاتا۔ یہ تجربہ اب آپ کر لیں۔ بہرحال گلاب خان بجائے خود ایک مضمون ہے اور اس موضوع پر پھر کبھی۔۔۔ کہنا یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد الہ دین کے چراغ کی، جسے کوتاہ اندیش افسر گھنٹی کا بٹن کہتے ہیں، دلخراش کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ گھنٹی اور اس کا بٹن تو خیر بازار سے دو چار پیسے میں خرید کر گھر کی میز

---

[۱۲] ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ کا انتھک چپڑاسی

پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور اپنی عادت کی تسلّی کے لیے اس پر افسرانہ انگلی بھی رکھی جا سکتی ہے، لیکن اس عمل کے بعد کسی جن کے نمودار ہونے کا امکان نہیں۔ شاید بیوی نمودار ہو کر ایک ہراس انگیز لہجے میں کان میں سرگوشی کرے گی: ''گھنٹی ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے باہر پھر چندہ لینے والے آئے ہیں۔'' اور چندہ لینے والوں کے آگے جن بھی بے اثر ہوتے ہیں۔

ایک اور حسرت! اب ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد جی ٹو[13] اور جی تھری دروازے پر مؤدبانہ دستک کے بعد شن[14] کر کے عرضِ مدعا کرنے نہیں آتے اور عرض بھی ایسی کہ جس میں لاکھ سر کے بعد ایک حرفِ مدعا ہوتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن تو ان[15] کا بڑا انتظار کیا لیکن آخر غیب سے ندا آئی کہ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا اور کوئی نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری روح فاقے کرنے لگی، کیونکہ ایک تازہ ریٹائرڈ افسر کی روحانی غذا بھی شن اور سلیوٹ ہی ہیں۔ شن اور سلیوٹ سے اچانک محرومی ایسی ہی ہے جیسے کسی معصوم کا یکلخت دودھ چھڑا دیا جائے۔ آپ ذرا کسی متاثرہ معصوم سے انٹرویو کر کے دیکھ لیں۔ بہر حال اب ہماری افسری کا دودھ چھڑایا جا چکا ہے۔ ہم تو اب یہ منظر بھی بے آہ کیے برداشت کر لیتے ہیں کہ ایک ایک پھول والے نیم لفٹین بھی پاس سے

---

[13] G-2 اور G-3 مخفف ہیں گریڈ دوم اور گریڈ سوم کے افسر جو بالترتیب میجر اور کپتان ہوتے ہیں۔ G-1 لفٹیننٹ کرنل ہوتا ہے۔

[14] شن مخفف ہے انگریزی لفظ ATTENTION کا جس کے حکم پر فوجی دونوں ایڑیاں جوڑ کر خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں۔

[15] SIR سینئیر افروں سے بات کرتے ہوئے اکثر استعمال ہوتا ہے۔

گزرتے وقت ہمیں سویلین سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے ہم فقط سویلین ہی نہیں بلکہ ۳۰۳[16] سے ایک ہوں۔ پھر چلتے چلتے ہمیں سناسنا کر کچی سی انگریزی میں یونٹ گپ بھی مارتے ہیں، وہی گپ جو سالہا سال ہم بھی انگریزی میں مار چکے ہیں اور اب بھی چاہیں تو ان لونڈوں کو دو چار سبق پڑھا دیں مگر ان تمام رموزِ افسری کو سینے میں چھپائے خاموش رہ جاتے ہیں۔

شن اور سلیوٹ کا کیا ذکر، اب تو سر، سر کی آواز بھی کم سنائی دیتی ہے۔ آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ایک اوسط درجے کا افسر دن میں کتنی مرتبہ سر کہتا ہے۔ اگر آپ کو اندازہ نہیں تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیسو[17] کے ایک معتبر افسر نے خفیہ ریسرچ کے بعد دریافت کیا ہے کہ ایک لفٹین دن میں چار سو بیس مرتبہ سر، سر کرتا ہے ایک کپتان تین سو دس مرتبہ اور ایک میجر دو سو پانچ مرتبہ اور قیس علی ہذا۔ آپ ان اعداد کو متعلقہ افسروں کی تعداد سے ضرب دیں تو آپ کو محسوس ہو گا کہ فوج مسلسل سر سراہٹ کے عالم میں ہے۔ البتہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسی سر سراہٹ پر فوج کی زندگی اور ضبط کا دارومدار ہے۔ ریسرچ کی رو سے اعلیٰ افسر بھی سر سراتے ہیں مگر کم اور جیسا کہ مناسب ہے، سر کی آواز سے ان کی زبان سے زیادہ کان مانوس ہوتے ہیں۔ ڈی اے

---

[16] ان سول افسروں کی تعداد جو جنرل یحییٰ کے مارشل لاء کے بعد نکالے گئے۔

[17] C.A.S.O فوج کا وہ محکمہ ہے جو مختلف قسم کے اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھتا ہے۔

ای[18] بھی ان برگزیدہ افسروں کی نچلی کڑی میں آتا ہے اور اس کی انا کی بھی سرسری تسکین ہو جاتی ہے مگر افسوس کہ ایک ریٹائرڈ ڈی اے ای کو بے تسکین ہی گزارا کرنا پڑتا ہے۔

اس دفعہ ریٹائرمنٹ کے بعد پہلی عید آئی تو ایک نئی کھٹاس کا تجربہ ہوا یعنی باہر سے آنے والے عید کارڈوں کی تعداد یکلخت گر کر آدھی رہ گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس عید پر جو آپ کی ڈائریکٹری کی پہلی عید ہے آپ کے عید کارڈوں میں اتنا ہی اضافہ ہو گیا ہو گا۔ برادرِ عزیز یہ دراصل میرا ہی مال ہے۔ اگر آپ مجھ سے عید کے بعد چارج لیتے تو یہ نامے بھی میرے نام ہی آتے۔ بہرحال اب خدا آپ کی عمر اور ملازمت دراز کرے، آپ چھ سات عیدیں تو مزے کریں لیکن اس دن کے لیے تیار رہیں جب ان عید کارڈوں کا بحرِ بیکراں ایک جوئے کم آب میں بدل جائے گا۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ ان عید کارڈوں کو دوام نہیں جن کے لکھنے والے آپ کی محبّت سے زیادہ اے سی آر[19] کی محبّت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ یہ قول شاید غلط تو نہیں لیکن اس کا اطلاق کرنل سردار خان[20]، کرنل بی ایم صدیقی، کرنل این ڈی احمد اور کیپٹن انور خان پر نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ اگلے وقتوں کے ہیں ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

---

[18] D.A.E ڈائریکٹر آف آرمی ایجوکیشن۔

[19] A.C.R یعنی سالانہ خفیہ رپورٹ جو ہر افسر پر لکھی جاتی ہے۔

[20] مصنّف کے چند رفقائے کار اور آرمی ایجوکیشن کور کے ممتاز افسر۔

فوج سے فارغ ہونے کے بعد دِل میں ایک پوشیدہ سی خوشی تھی کہ اب فائلوں، نوٹوں اور پی یو سی[۲۱] وغیرہ سے نجات ملے گی، اور اب مل بھی گئی ہے، لیکن ایک لفظ عرصے تک میرا پیچھا کرتا رہا۔ یہی ہمارا پرانا دوست Immediate[22]۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد میں جب یہ لیبل کہیں دیکھ لیتا، بِدک سا جاتا اور کافی دیر بِدکا رہتا حتیٰ کہ یاد آتا ریٹائر ہو گیا ہوں۔ اب وقت گذرنے کے ساتھ سنبھل گیا ہوں۔ آج کل امیجی ایٹ کا لفظ سامنے آ نجائے تو گہرا سانس لے کر اسے مناسب حقارت سے دیکھتا ہوں اور دِل کو سمجھاتا ہوں کہ اختلاج کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اب اس لفظ میں ڈنک باقی نہیں۔ اگر دِل میں خفیف سا مرمر بھی پیدا ہو تو اسے طعنہ دیتا ہوں کہ تو کوئی جی ون یا ڈی۔ اے۔ ای کا دِل ہے جو اتنی سی بات پر دھڑک اٹھا۔ ان طعنوں کا دِل پر خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ چنانچہ اگلے روز ہمارا سامنا Most Immediate[23] سے ہو گیا۔

آنکھ پھر ذرا جھپکی لیکن دِل؟ ہمارا دِل اسی مستانہ رفتار سے چلتا رہا۔

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ

اب وہ پہلی کی درازیٔ شبِ ہجراں میں نہیں

---

[۲۱] P.U.C پیپر انڈر ایڈمنسٹریشن۔

[22] فوری توجّہ کا مستحق۔

[23] اشد ضروری۔

بھئی، ریٹائرمنٹ کا ایک نہایت ہی وحشت ناک پہلو ہے جس سے آج چھ ماہ بعد بھی مفر نہیں۔ آپ سب گواہ ہیں کہ ہم فقط ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ زندگی سے ہی ریٹائر نہیں ہو گئے۔ لیکن لوگ ہیں کہ تعزیت کو چلے آ رہے ہیں اور بڑے رقّت خیز مکالمے کرتے ہیں۔ آہ بھر کر ابتدائے کلام کرتے ہیں:

"خدا کی مرضی۔"

میں صبر و رضا کی تصویر بن کر جواب دیتا ہوں:

"خدا کے علاوہ اے آئی پی[۲۴] کی مرضی بھی تھی ویسے احوال یہ ہے کہ زندہ ہوں۔"

"کیا ممکن نہ تھا کہ آپ کو توسیع مل جاتی؟"

"پھر بھی ایک دن تو کوچ کرنا تھا۔"

"ٹھیک ہے مگر ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟"

"عمر؟ یہی برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن۔۔۔" کچھ نہیں سمجھے۔

"اور سردار خان[۲۵] کو تین سال کی مل گئی تھی۔"

---

[۲۴] A.I.P آرمی انسٹرکشن جس میں ملازمت اور سبکدوشی کے قواعد و ضوابط لکھے ہوتے ہیں۔

[۲۵] کرنل سردار خان سابق کمانڈنٹ ملٹری کالج، جہلم۔

”جی ہاں وہ بھی آخر تمام ہو گئی۔“

”سچ ہے ثبات فقط اللہ کی ذات کو ہے اناللہ و انا الیہ راجعون۔“

یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس آخری آیت کریمہ کا روئے سخن میری طرف ہے یا سردار خان کی طرف جو دونوں صورتوں میں ہر چند کہ بر حق ہے ذرا قبل از وقت ہے۔

بہر حال تعزیت ختم ہوتی ہے۔ اور وہ بزرگ اس کام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے لیے تشریف لائے تھے، یعنی نئے ڈائریکٹر کو سفارش کرو کہ سارے قاعدے توڑ کر ہمارا نورِ چشم ملٹری کالج میں داخل کرے اور کالج کا چراغ گل کر دے۔ ریٹائرمنٹ اب پرانی ہونے کو ہے مگر سوچتا ہوں کہ کب تک یہ مہربان بر سرِ مطلب آنے سے پہلے تعزیتی تمہیدیں باندھتے رہیں گے۔

کھٹاس کے چند اور پہلو بھی ہیں لیکن اب اس قصّے کو مختصر کرتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے میٹھے پہلو کہیں زیادہ قابلِ ذکر ہیں اور بخدا ایک پہلو تو شہد کی طرح شیریں ہے اور وہ ہے صبح کا نہ جاگنا! یعنی سوئے رہنا! بلکہ جاگ کر سو جانا! غالب کا خیال تھا کہ نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں۔ تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں۔ نئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ غالب کو مغالطہ ہوا تھا۔ ورنہ نیند، دماغ اور راتیں اس شخص کی ہیں جو تازہ تازہ ریٹائر ہوا ہو۔۔۔ آپ نے غور کیا کہ کم و بیش پچیس برس سے آپ

اور میں ایک ایسے وقت پر جاگ رہے ہیں جب پرند چرند اور جملہ تہجد گزار بھی سو رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاگنا خوفِ خدا یا شوقِ نماز کے لیے نہیں بلکہ پریڈ سے لیٹ ہونے کے خوف سے۔ آپ اور میں تو شاید ایسے اسیر زلف نہیں لیکن وہ جن کے بازوؤں پر سچ مچ زلفیں پریشاں ہوتی ہیں انہیں بھی صبح چار بجے کے بعد یہ جاں بخش زلفیں ڈسنے لگتی ہیں۔ ادھر گھڑی نے الارم بجایا اور ادھر یہ زلفوں کا جال توڑ کر بھاگے۔ اور وہ نیک بخت دِل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہتی رہ گئی کہ:

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دستِ ناتواں سے

لیکن غریب دامن نہ جھٹکے تو خواہ مخواہ ری پر ایمانڈ[۲۶] لے لے! لیکن دوست، آ تجھ کو بتاؤں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد دامن جھٹکنے کی ضرورت ہے نہ زلفیں سمیٹے کی بلکہ کوئی دامن گیر میسّر ہو تو اسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر، اور پھر اس کے بعد اتنا وافر وقت ہوتا ہے کہ نہایت تسلّی سے اپنے قلب و نظر اور ہوش و خرد شکار کرائے جا سکتے ہیں۔ ذرا دیکھیں ہم ریٹائر ہو کر ہوش و خرد کھونے کی برملا پیشکش کر رہے ہیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو دوسرے دن کرنل شعیب[۲۷] کے پاس بھیج دیئے جائیں۔۔۔ اب وقت کا دیو ہم پر مسلط نہیں۔ بلکہ ہم اس پر سوار ہیں۔ گھڑی پہنتے ہیں لیکن اس سے مشورہ نہیں کرتے۔ اگلے روز ایک بدتمیز نے ہم سے ایک عجیب سا

---

[۲۶] Reprimand ایک تحریری سزا جو افسروں کو دی جاتی ہے۔

[۲۷] کرنل شعیب فوج کے مشہور دماغی ڈاکٹر ہیں۔

سوال کیا۔ بولا ”جناب آج کل جی ایچ کیو کتنے بجے کھلتا ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”او! خدا کے بندے۔ کوئی ہوش کی بات کر۔ اگر ہم اب بھی جی ایچ کیو کھلنے کا وقت یاد رکھیں تو ہمارے ریٹائر ہونے کا کیا فائدہ؟ کل تم ہم سے پوچھنے لگو گے کہ جی ایچ کیو کا رستہ کون سا ہے؟“

اور ہاں اب ہمارے دِل سے ڈاکٹر کا خوف نکل گیا ہے حتیٰ کہ دماغی ڈاکٹر کے سامنے جانے سے بھی ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا نا کہ دیوانہ ہے۔ تو دیوانہ سہی۔ کیٹیگری[۲۸] ہی گرے گی نا۔ تو ٹھیک ہے، فرش پر ہی پڑے رہے گی۔ باقی رہے غیر دماغی ڈاکٹر تو وہ تو بالکل بے ضرر نظر آتے ہیں۔ آپ لوگ انہیں اپنی نبض دکھاتے ہوئے بھی کانپتے رہتے ہیں اور اے سی آر[۲۹] کے موسم میں تو آپ کی نبض ڈاکٹر کو دیکھ کر ہی ڈوبنے لگتی ہے۔ لیکن ہم بے لحاظ موسم دھڑلے سے پوری آستین کھول کر بازو پیش کر دیتے ہیں کہ لو کالی پٹی باندھ کر ہمارے دِل کا حساب لے لو۔ بنیان اتار کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لو ٹوٹی لگا کر ہمارے سینے کے راز پا لو۔ اور ہمیشہ جواب ملتا ہے کہ تمہارے اندر ہیروں اور موتیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے منہ سے ڈاکٹر کے حق میں دعا نکلتی ہے کہ جیتے رہو۔ آپ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کبھی کسی

---

[۲۸] CATEGORY ہر افسر اپنی صحت کے لحاظ سے میڈیکل کیٹیگری A،B یا C وغیرہ میں ہوتا ہے۔ سب سے پست کیٹیگری E ہے۔ اور ایسا افسر بیکار ہوتا ہے اور گھر بھیج دیا جاتا ہے۔

[۲۹] ہر سال خفیہ رپورٹ میں ڈاکٹر افسر کا طبّی معائنہ کر کے اس کی کیٹیگری کا تعین کرتا ہے۔

ڈاکٹر کو دعا دی ہے؟ یا ریٹائرمنٹ سے پہلے کسی کو دعا دینے کا ارادہ ہے؟ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو آپ سچ بول رہے ہیں۔

ایک اور ظلم جو مجھ پر ہوتا تھا۔۔۔ اور اب آپ پر ہو رہا ہو گا۔۔۔ بندہ اس سے آزاد ہو گیا ہے۔ میری مراد دوپہر کی چائے سے ہے جو جی ون کے کمرے میں پائنتی میں بیٹھ کر پی جاتی تھی اور غالباً آج کل بھی وہیں پی جاتی ہے۔ جملہ چائے نوش جمع ہوتے تھے اور زبیری صاحب[۳۰] دستِ خاص سے ایک گرما گرم پیالی تیار کر کے میرِ مجلس کو یعنی ہمیں پیش کرتے تھے اور ہم اسے ایک مستی کے عالم میں پی جانے کی نیّت سے اٹھاتے ہی تھے کہ ڈائریکٹر کے کمرے میں سفید[۳۱] ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تھی۔ اس خیال سے کہ ایک لمحے کی تاخیر سے ٹیلیفون کے دوسرے سرے پر مزاجِ یار برہم نہ ہو جائے، ہاتھ میں پھڑ پھڑاتی پیالی لئے کرسیوں پر سے کودتے، کواڑوں سے ٹکراتے، ٹیلی فون پر جا گرتے تھے۔ لیکن اس اثناء میں ہمارے کرم فرما سچ مچ زحمتِ انتظار سے نڈھال ہو کر دستِ ناز سے رسیور رکھ چکے ہوتے تھے اور ہماری لبیک کی صدا مائیکروفون کے حلق سے ٹکرا کر ہمارے اپنے کمرے میں پریشان ہوتی رہتی تھی۔ بلکہ کئی دفعہ لبیک کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ ٹیلی فون تک پہنچتے پہنچتے کبھی پیالی کے اور کبھی خاکسار ڈائریکٹر کے

---

[۳۰] مصنّف کی ڈائریکٹری کے زمانے میں سویلین افسر تھے۔ انیس مرتضٰے زبیری اپنی شرافت اور قابلیت کی وجہ سے جی ایچ کیو کی جانی پہچانی شخصیت تھے اور ہیں۔

[۳۱] وہ ٹیلی فون جس پر جرنیل صاحب سے بات چیت ہوتی تھی۔

لکھے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ مگر اب ریٹائرمنٹ کے بعد، یہ حادثے یکسر بند ہوگئے ہیں۔ اب چائے کے دوران گھنٹی ہے تو افراتفری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹیلیفون نے از خود ہی جواب دے دیا ہو کہ صاحب چائے پی رہے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر رِنگ کیجئے گا۔

اوپر کھٹاس کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ الہ دین کا چراغ کھو گیا ہے اور یہ کہ ریٹائرمنٹ کے پہلے ایّام میں اس چراغ کے کھو جانے سے بہت رنج ہوا لیکن بعد میں معلوم کہ یہ دن بے جا تھا کہ قدرت نے اس کی بڑی مثبت تلافی کر دی ہے۔ یعنی بے شک اب ہماری گھنٹی پر ہمارے سامنے کوئی جن نمودار نہیں ہوتا لیکن اب ہمیں بھی بیرونی گھنٹی پر کسی کے سامنے جن بن کر نمودار نہیں ہونا پڑتا۔ اب فون اُٹھانے سے پہلے یہ وسوسے نہیں ہوتے کہ یہ گھنٹی کسی بڑے الہ دین کی ہے یا درمیانے کی۔ اور نہ خوف طاری ہوتا ہے کہ خدا جانے کون سی مہم سر کرنے کے لئے طلب کیا جارہا ہے۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے بعض اوقات ہمیں بڑی کٹھن مہمیں سَر کرنی پڑتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ دو گھنٹے کے اندر ثبوت لاؤ کہ فوج کو تعلیم کی واقعی ضرورت ہے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اب اس بات کی بھی تشویش نہیں کہ آج ہمارے "باس" کے جگر میں فتور ہے یا نہیں۔ یا صبح دفتر میں آنے سے پہلے ان کی بیگم کا مزاج معتدل تھا یا متلاطم کہ ان دِنوں ان

حادثات کا ہماری قسمت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ اب ہمیں اپنے باس کی نسبت اپنے جگر اور اپنی بیگم کے مزاج کا زیادہ پاس ہے اور بفضلِ خدا دونوں خیریت سے ہیں۔

سو جانشینِ من۔ مژدہ ہو کہ مجموعی طور پر ریٹائرمنٹ میں شیرینی ہی شیرینی ہے۔ ترشی کی مقدار بس اسی قدر ہے جتنا طعام میں نمک۔ لیکن اس ترشی سے شیرنی کا شیرہ اور گاڑھا ہو گیا ہے لیکن اس شیرینی سے لطف اندوز ہونے کی ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ کہ ریٹائر ہونے سے کچھ روز پہلے لنڈی کوتل جائیں اور دو چار اعلیٰ ولایتی سوٹ، سویٹر، ٹائیاں اور موزے لے آئیں۔ باٹا سے کچھ تابدار جوتوں کے جوڑے خریدیں۔ ولایت میں کوئی درک ہو تو کرسٹی کی فیلٹ ہیٹ اور فان ہیوسن کی قمیصیں منگوائیں اور ریٹائرمنٹ کے دوسرے دن گھر سے نکلیں تو دولہا بن کر نکلیں۔ یعنی آپ کی ہمسائی دیکھے تو اپنے میاں کے بال نوچ لے۔ مقصد ہمسائی کا گھر برباد کرنا نہیں بلکہ اپنی ریٹائرمنٹ کو آباد کرنا ہے۔ ہمسائی کو تو محض لٹمس پیپر کی طرح ٹسٹ کے طور پر استعمال میں لانا ہے۔ وہ میاں بیوی تو زود یا بدیر صلح کر ہی لیں گے۔ اگر آپ دولھا بن گئے تو آپ خوش ہوں گے۔ آپ کا خدا خوش ہو گا اور خلقِ خدا خوش ہو گی۔ لیکن اگر آپ خدانخواستہ پھٹیچر نکلے تو نہ ہمسائی بخشے گی اور نہ خدا۔ اور طعنہ دیں گے بُت کہ کرنل کا خدا کوئی نہیں۔ اور معلوم ہے یہ بُت کس انداز سے طعنہ دیتے ہیں؟ یہ کہتے ہیں کہ اگر بس سٹاپ پر کوئی شخص میلی ٹوپی، کچیلی ٹائی ان دھلی قمیص اور بے استری سوٹ پہنے، دو دن کی شیو بڑھائے، بس کے انتظار میں کھڑا مانگ کر اخبار پڑھ رہا ہو تو ضرور

کوئی ریٹائرڈ کرنل ہو گا۔ دیکھا ہماری نصیحت نہ ماننے کا نتیجہ! ریٹائرڈ شدہ کرنیلی بڑی چیز ہے لیکن لباس کی محتاج ہے۔ جس نے یہ نکتہ نہ پایا وہ بس اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مجسٹریٹ صاحب سبزی منڈی میں پہنچ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ مجسٹریٹ صاحب نے کرسئ عدالت پر بیٹھے ایک سبزی فروش سے کہا کہ گواہ پیش کرو کہ ملزم تمہاری دکان سے مولیاں لے بھاگا۔ بولا۔ ”حضور۔ اس عدالت میں سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے کہ وقوعہ کے وقت عدالت خود ساتھ کی دکان سے گاجریں خرید رہی تھی۔“

سبق اس کہانی سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ عدالت بے شک گاجریں خریدتی رہے مگر کرنیلی سے مت گاجریں خریدوایئے۔

# یوسفِ ثانی

یہ قصّہ ہے میرا اور میرے دوست یوسف کا۔ واقعہ سنانے سے پہلے اپنا تعارف کرادوں۔ میرا نام مسعود ہے اور میں ایک چھوٹا ساز میندار ہوں۔ میرے دوست کا پیشہ مجھ سے کچھ مختلف ہے۔ کتنا مختلف؟ آپ کو ابھی اندازہ ہو جائے گا۔

یہ آج سے کئی سال قبل کا واقعہ ہے جب ہم دونوں لاہور کے ایک کالج میں پڑھتے تھے۔ یوسف میرے ہم جماعت تھے لیکن آپ کی یوسفیت فقط آپ کے نام ہی تک محدود تھی۔ آپ کی شکل و صورت اس کے اثر سے یکسر محفوظ تھی۔ آپ کی ولدیت کی ترکیب میں بھی کوئی پیغمبرانہ عنصر نہ تھا۔ مشہور تھا کہ آپ کے والد بزرگوار ذرا بہتر قسم کے میراثی ہیں اور فرزندِ دلبند کو بھی اس نظریے سے ایسا شدید اختلاف نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ذاتی کردار سے بھی پدری شہرت کو کمک پہنچاتے رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی کام کو انجام دیتے ہوئے آپ نے اس خاکسار کو بھی تقریباً انجام تک پہنچا دیا۔ تفصیل ذرا بعد میں۔

یوسف حسنِ صورت اور نجابت میں اپنے گراں قدر ہم نام سے بے شک ایک قطب کے فاصلے پر کھڑا تھا، تاہم رونق آفرینی میں ایک پیغمبرانہ شان رکھتا تھا اور میراثی ہونے کے باوجود۔۔۔ یا شاید میراثی ہونے کی وجہ سے۔۔۔ ہم جماعتوں میں مقبول و محبوب تھا۔ جہاں یوسف تھا، وہاں ہنسی تھی، ہنگامہ تھا، قہقہے تھے، چہچہے تھے۔۔۔ اور ہاں یوسف میں ایک اور کمال بھی تھا۔ وہ پیدائشی موسیقار تھا۔ جب بھی اتوار کی رات کو ہوٹل کی چھت پر سِتار بجاتا یا گانا گاتا تو چلتے آدمی اور ٹوٹتے تارے رُک جاتے۔

گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو لاہور سے پنڈی آنے والی گاڑی میں یوسف میرا ہم سفر تھا لیکن آج خلافِ معمول خاموش، بلکہ فکر مند سا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولا:

"ایک مشکل آپڑی ہے۔ کاش تم مدد کر سکو۔"

میں نے کہا: "یقیناً، بشرطیکہ تم مدد جائز قسم کی مانگو۔"

بولا: "جائز ناجائز کی پہچان تو شرعی مسئلہ ہے اور کسی مفتی کا سرٹیفکیٹ ساتھ نہیں لایا۔"

میں نے کہا: "تم بات تو کرو۔ میں خود سرٹیفکیٹ دے دوں گا، بشرطیکہ۔۔۔"

بولا: "جس شخص کے منہ سے دو جملوں میں دو بشرطیکہ نکلیں وہ وکیل ہو سکتا ہے دوست نہیں ہو سکتا۔ مروّت نام تھا جس کا گئی مسعود کے گھر سے"۔

اور یہ کہہ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

میں نے کہا: "ارے ناراض ہونے لگے۔ چلو، مانگو کیا مانگتے ہو۔ تمہاری خاطر تو ہم جان بھی دے دیں گے۔"

بولا: "ہو اوعدہ؟"

کہا: "ہو اوعدہ۔ مگر اب جلد بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟"

بولا: "معاملہ ہماری شادی کا ہے"۔

"مبارک باد۔۔۔ اور ہمارے ذمّے کیا فرض ہے؟"

"وہ تمہیں دولہا بننا ہے!"

"تمہارا مطلب ہے شہ بالا؟"

"نہیں جناب! میرا مطلب ہے دولہا۔ مجھے دولھے اور شہ بالے میں تمیز ہے"۔

"یعنی شادی تمہاری ہو گی، دولہا ہم بنیں گے۔ اس مغالطے کے عواقب بھی سمجھتے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپ صرف دو گھنٹے کے لئے دولہا بنیں گے، عارضی دولہا۔"

"عارضی دولہا کیا شے ہوتی ہے؟ تاریخ میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے؟"

”تم ہاں کرو تو مل جائے گی۔“

مجھے محسوس ہوا کہ میں نے واقعی کوئی غیر شرعی وعدہ کر لیا ہے۔ بہر حال اب فرار خارج از بحث تھا۔ کہا۔

”بہت اچھا بتاؤ ہمیں کب کہاں اور کیوں عارضی دولہا بننا ہے؟“

یوسف بولا: ”آپ بے تاب نہ ہوں۔ ایسے نیک کاموں میں تعجیل مستحسن نہیں۔ ہاں تو عارضی دولہا آپ آج ہی بنیں گے۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) کوئی پینتالیس منٹ کے بعد، یعنی گوجرانوالہ میں۔ یہ تو ہو گیا کب اور کہاں کا جواب، جہاں تک کیوں کا تعلّق ہے ذرا توجّہ سے سنئے۔“

میں نے اپنا ہاتھ زانو سے اُٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیا اور اپنی تمام تر توجّہ یوسف کے چہرے پر گاڑ دی۔ یوسف نے کیوں کی تشریح شروع کی:

”تو صاحبِ مہربان! عرصہ دوماہ کا ہوا اس حقیر فقیر نے حال سے مایوس ہو کر اور مستقبل سے امید باندھ کر قصد شادی کا کیا اور ایک اخبار میں اشتہار، ضرورت رشتہ کا بدیں مضمون دیا کہ ضرورت ہے ایک خوش وضع و خوش اطوار نجیب الطرفین کنوارے رئیس زادے کے لئے ایک زہرہ جمال، خوش اوقات، پابندِ صوم و صلوۃ، میٹرک پاس

حسینہ کی۔ اور کہ سنہری موقع ہے نکتہ شناس والدین کے لئے جو بصیغۂ راز خط و کتابت کر سکتے ہیں۔"

پوچھا: "یہ نجیب الطرفین رئیس زادے تم ہی تھے؟"

بولا: "بے شک یہ اسی خاکسار کا اشتہاری روپ تھا۔"

"پھر؟"

پھر بیسیوں خط آئے۔ بیسیوں جواب گئے، لیکن ایک کے سوا جملہ والدین مع دختران ِ عزیز، یکے بعد دیگرے میدان چھوڑ گئے اور جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار۔ لیکن ان کا نام قیس نہیں، خان کرامت علی خاں ہے۔ گوجرانوالے میں بستے ہیں اور عین اسی لمحے پھولوں کے ہار لئے سٹیشن پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم دن کا کھانا انہی کے ہاں کھائیں گے۔ دیکھیں گے، دکھوائیں گے اور پھر دو گھنٹے بعد اگلی گاڑی سے سفر جاری رکھیں گے۔

"یہ فریب کاری ہے۔"

"مگر بے ضرر ہے اور آخری مقصد نیک ہے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اور اچھے دوست بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔"

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“

”وہی جو میں کہوں۔ تم نے وعدہ کر رکھا ہے۔“

”اچھا بتاؤ، مجھے کب دولہا بننا ہے؟“

”گاڑی سے اُترتے ہی پلیٹ فارم پر پاؤں رکھتے ہی تم یوسف ہو گئے اور یہ خاکسار مسعود۔“

”آخر اس حرکت کی ضرورت؟“

”تم نے اس خاکسار کا شجرۂ نسب تو نہیں دیکھا، لیکن چہرہ تو ایک مدّت سے دیکھ رہے ہو۔ کیا کسی زاویے سے اس روسیاہ میں رئیس زادگی کے آثار نظر آتے ہیں؟ ذرا ایمان سے کہنا۔“

ایمان کی رو سے جواب نفی میں تھا۔ میں نے کہا۔

”ایسے آثار تو ناپید ہیں، لیکن ہمارے چہرے سے بھی کسی ریاست کا پتہ نہیں چلتا۔“

”آپ کتنے ہی بے توفیقے کیوں نہ ہوں، اس ناچیز کے مقابلے میں پرنس علی خاں لگتے ہیں۔“

”یعنی تم ہماری شکل کا استعمال محض شہزادی کے محل میں داخلے کے لئے کر رہے ہو؟“

”بجا فرمایا حضور نے، ورنہ اس رنگ و رخ کے ساتھ اس خاکسار کو سٹیشن ہی سے رخصت کر دیا جائے گا۔“

”بھئی تم صاحبِ کمال آدمی ہو۔ ہم تو محض نمائشی کھلونے ہیں۔“

”ابتدائی تعارف کے لئے شکل بڑی اکسیر شے ہے۔ کمالات بعد میں آتے ہیں۔“

”لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ پرنس علی خاں نے اگر سوئمبر جیت بھی لیا تو پرنس یوسف کو کیا ثواب ملے گا؟“

”پرنس علی خاں اس کارِ خیر کے بعد کنارہ کش ہو جائیں گے اور شہزادی کا ثواب اس غلام کے حصّے میں آئے گا۔“

”اگر شہزادی نے ایصالِ ثواب سے انکار کر دیا تو؟ آخر وہ بھی منہ میں زبان رکھتی ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے زبان رکھتی ہے، وگرنہ گونگی جورو بڑی ناقابلِ فہم مصیبت ہوتی ہے۔“

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ اس لڑکی میں کوئی خاص خوبی ہے جو اس قدر دیوانے ہو رہے ہو؟“

”کئی خاص خوبیاں ہیں، لیکن ایک عارضی دولھے کو ان میں دلچسپی نہیں لینا چاہیے۔“

میں نے ہار کر کہا ”اچھا۔ کوئی آخری ہدایت میرے لئے؟ کوئی خاص حرکت جو مجھے کرنا یا نہ کرنا ہو؟“

”میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور حسبِ موقع ہدایات جاری کرتا رہوں گا۔ تم بے فکر رہو“۔

”ٹھیک ہے۔ بے فکر رہوں گا۔“

بولا ”اب جاؤ۔ غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھو لو۔ سسرال قریب ہے۔“

میں غسل خانے سے نکلا تو گاڑی آہستہ آہستہ گوجرانوالہ کے سٹیشن پر رُک رہی تھی۔ خدا جانے یوسف نے اپنی اشتہاری سسرال کو کیا نشانی بتا رکھی تھی۔ میں گاڑی سے اُترا ہی تھا کہ ایک اُدھیڑ عمر کے معزّز سے بزرگ، چند کم بزرگ ساتھیوں کے ساتھ میری طرف بڑھے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے

”میرا خیال ہے محمد یوسف آپ ہی ہیں۔“

میں نے اصلی یوسف کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک مثبت مسکراہٹ کے ساتھ نگاہیں نیچی کر لیں اور میں نے اشارہ پا کر کہا

"جی قبلہ۔ میرا ہی نام ہی یوسف ہے۔"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ اچھا، مجھے تو تم جانتے ہی ہو، میں کرامت علی خاں ہوں۔ یہ سلامت علی خاں ہیں، حمیدہ کے چھوٹے بھائی۔"

میں نے نقلی مسعود یعنی یوسف کا تعارف کرایا۔

"یہ ہیں میرے عزیز دوست اور باکمال ہم جماعت مسعود۔"

سب نے اس کے ساتھ گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ یوسف نے جوابی گرمجوشی میں حسبِ عادت کچھ لطیفے بھی شامل کر دیئے اور سب لوگ کھکھلا کر ہنسنے لگے۔ انور اور ارشد کے ہاتھوں میں ہار تھے۔ ایک نے میرے گلے میں ڈال رہا۔ دوسرے نے یوسف کے گلے میں۔ سٹیشن سے نکلے تو ہمیں کار میں بٹھایا گیا۔ خان صاحب ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور ہم دونوں پچھلی نشست پر۔ کار چلی تو خان صاحب بولے:

"عزیز، تمہارے خطوں سے ہم تمہارے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ صرف دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ماشاء اللہ تم سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

میں نے برخوردارانہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"آپ کی عنایت ہے۔"

”اچھا بتاؤ خان بہادر صاحب کا کیا حال ہے؟“

میرے منہ سے جھٹ نکلا۔

”کون سے خان بہادر صاحب؟“

یوسف نے مجھے کھینچ کر کہنی ماری اور خان صاحب کو سنا کر مجھ سے کہا۔

”خان صاحب آپ کے ابّا جان کے متعلق پوچھ رہے ہیں۔“

میں نے یوسف کو قہر بھری نگاہ سے دیکھا اور دِل میں کہا کہ اگر تم نے اپنے آپ کو کسی فرضی خان بہادر کی فرزندی میں دے دیا تھا، تو مجھے تو معاف رکھتے۔ جی میں آئی کہہ دوں کہ خان بہادر صاحب سارنگی بجا رہے ہیں لیکن خان صاحب سے بے تکلفی نہ تھی۔ عرض کیا۔

”اچھا، آپ ابّا جان کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟ اچھے ہیں۔ آپ کو سلام کہتے تھے۔“

”تو کیا وہ وطن لوٹ آئے ہیں؟ تم نے تو لکھا تھا دو ماہ سے انگلستان میں علاج کرا رہے ہیں۔“

اب میرے ابّا جان بخریتِ تمام اپنے گاؤں میں چودھراہٹ کر رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا جواب دوں کہ فوراً یوسف نے کان میں سرگوشی کی:

”خط۔ خط۔ خط۔“

چنانچہ میں نے کہا۔

”ابّا جان نے آپ کو خط میں سلام لکھا ہے۔“

خان صاحب بولے: ”تو کیا وہ ہوش میں آ گئے ہیں؟ ان کے دماغ میں تو رسولی تھی نا۔“

یہ میرے صبر کی آخری حد تھی۔ میں نے کسی قدر جھنجھلا کر کہا:

”قبلہ وہ رسولی کا ذکر تو میں نے ان کے والد کی علالت کے ضمن میں کیا تھا اور وہ بے چارے اللہ کو پیارے بھی ہو چکے ہیں۔“

خان صاحب نے جھٹ انا للہ پڑھی۔ یوسف سے اظہارِ تعزیت کیا جو اسے قبول کرنا پڑی۔ پھر یوسف نے پورے زور سے مجھے کہنی ماری اور یہ اس کا حق تھا اگرچہ میں درد سے بلبلا اُٹھا۔

اتنے میں خان صاحب کا گھر آ گیا۔ خان صاحب کھانے پینے اور بظاہر خوش ذوق آدمی تھے۔ ان کے دیوان خانے کی آرائش مشرقی انداز کی تھی۔ چاندنی، گاؤ تکیے، شمع وان وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیز صاف شفاف چم چم کرتی ہوئی۔ ایک طرف چوبی تخت پر چند موسیقی کے آلات رکھے تھے: ستار، طبلہ اور ہارمونیم جیسے ابھی ابھی کوئی ریاض کرنے

والا ہو یا کر کے اُٹھا ہو۔ یوسف کو اور مجھے ایک خاص مسند پر بٹھایا گیا اور باتیں شروع ہوئیں۔ یوسف نے چھوٹتے ہی مجلس کو زعفران زار بنا دیا اور تمام حاضرین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہمارے چہرے سے بمشکل وہ خفگی کی تہ اُتری تھی جو ابّا جان کی فرضی رسولی سے پیدا ہوئی تھی۔

اتنے میں ایک خادمہ آئی اور حمیدہ کی والدہ کا پیغام لائی کہ لڑکے کو زنانے میں بھیجا جائے۔ خان صاحب نے ساتھ کے کمرے کی چِق اٹھائی اور میرا بازو پکڑ کر اندر قدم رکھنے کو کہا۔ اندر قدم رکھا تو محسوس ہوا کہ روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام۔ کمرہ لڑکیوں سے بھرا پڑا تھا، لیکن یہ بتانا مشکل نہ تھا کہ حمیدہ کون ہے۔ اس کا حُسن ایک علامتی گھونگھٹ سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں ہوں مہر عالمتاب، میں ہوں حقیقتِ منتظر اور عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے۔ حمیدہ نے مجھے فقط ایک نظر دیکھا اور اک تیر ایسا سینے میں مارا کہ ہائے ہائے۔ اس قتالہ کے قائل تو شاید اصلی پرنس علی خان بھی نہ تھے۔ بہر حال پرنس علی خاں کی عدم موجودگی میں سرِ دست دو امیدوار ہی تھے۔ یوسف اور ہم ! ہمارے نزدیک ایک میراثی زادہ یقیناً اس درِ شہوار کا سزاوار نہ تھا۔ یوسف بے شک ہمارا دوست تھا اور باہمی معاہدے کی رُو سے ہم محض عارضی دولھے تھے، تاہم اب وہ حالات نہ تھے جو چِق اُلٹنے سے پیشتر تھے۔ ہمیں کئی مقولے یاد آئے جن کی رُو سے ہم وعدے سے پھِر سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ جنگ اور محبّت میں ہر بات جائز ہوتی

ہے چنانچہ ہم نے طے کر لیا کہ حمیدہ اب ہماری ہے اور ہماری رہے گی۔ باقی رہے یوسف، تو ان کی شادی کی معقول سی مراثن سے کرادی جائے گی۔

حمیدہ کی ماں نے بڑی شفقت سے ہمارا مزاج پوچھا۔ چند خواتین اور حمیدہ کی سہیلیوں سے ہمارا تعارف کرایا لیکن ہمیں عشق کے اس ناگہانی حملے میں لڑکیوں کے نام یاد رکھنے کا مزاج نہ تھا۔ اتنے میں حمیدہ کی ایک سہیلی نے سالیوں کے انداز میں ایک سوال کیا۔

"چشمِ بدور، آپ کس جماعت میں پڑھتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "فورتھ ائیر میں۔"

دوسری بولی: "ماشاء اللہ آپ کتنے سالوں سے فورتھ ائیر میں ہیں؟ دو سال سے؟ چار سال سے؟"

میں نے کہا: "ابھی تو ایک سال بھی نہیں ہوا۔"

تیسری بولی: "اری تم بے تاب کیوں ہوتی ہو۔ ابھی بچّے ہی تو ہیں۔ وقت آیا تو دو چار سال فورتھ ائیر میں دم لے لیں گے۔"

حمیدہ کی ماں نے انہیں ڈانٹا:

"تم بہت شریر ہو گئی ہو نجمہ۔ یہ انشاء اللہ اسی سال پاس ہوں گے۔"

ایک بولی: "پاس نہ ہوئے تو فیل ہو جائیں گے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

میں نے اس مزاق کے جواب میں ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا، اور سر اُٹھایا تو ایک اور سنگ آیا۔

"سنا ہے آپ گاتے بھی ہیں؟"

دوسری بولی: "اور سِتار بھی بجاتے ہیں؟"

میں نے برخورداری اور اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔"

تیسری جھٹ بولی: "چپ رہو جی۔ انہیں موسیقی سے پرہیز ہے۔ حکیم نابینا نے منع کیا ہے۔"

چوتھی بولی: "اور ٹھیک بھی تو ہے۔ کل گونگے پہلوان نے ایک فلمی گانا سن لیا اور اسے خسرہ نکل آیا۔"

میں نے آہستہ سے کہا: "نہیں نہیں، مجھے موسیقی سے پرہیز نہیں۔ سُن لیتا ہوں۔"

اس پر نجمہ چلائی: "لانا لانا، مٹھائی لانا، بانٹنی ہے۔"

کسی نے پوچھا: ”کس خوشی میں؟“

نجمہ بولی: ”اس خوشی میں کہ بھائی جان موسیقی سُن لیتے ہیں۔ ہے نا خدا کی قدرت؟“

ایک اور بولی: ”اللہ کا شکر ہے موسیقی سے ٹکّر نہیں لے لیتے۔“

اس پر قہقہہ پڑا اور ایک طنّاز سی لڑکی بولی۔

”بھئی انہیں تنگ نہ کریں۔ آخر گانا سُننا کون سا کارِ ثواب ہے؟“

یہ سن کر خدا جانے میرے منہ سے کیوں نکل گیا۔

”جی ہاں۔ شہنشاہ اورنگ زیب تو گانا سُننا گناہ سمجھتا تھا۔“

کہیں سے آواز آئی: ”آپ کو معلوم ہے ان کے عہد میں موسیقی کا جنازہ نکلا تھا؟“

یہ سنتے ہی میرے قریب بیٹھی لڑکی بلا تامل بولی۔

”کیوں نہیں۔ بھائی جان خود اس جنازے میں شامل تھے۔“

اس پر طنّاز لڑکی نے اصلاح دی۔

”یہ کیوں موسیقی کے سوگواروں میں شامل ہوتے؟ یہ تو جہاں پناہ کے ساتھ بیٹھ کر ٹوپیاں کاڑھتے تھے۔“

اس نوک جھونک کے دوران میں حمیدہ خاموش بیٹھی رہی۔ میں سمجھا۔ مشرقی شرم وحیا کا تقاضا ہے۔ اور کھُل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ لیکن اتنے میں ناگہاں دیوان خانے سے سِتار کی نشیلی جھنکار کا ایک مدھم مگر دلاویز سا جھونکا آیا۔ معاً حمیدہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے اپنے چشم و گوش کا رخ چِق کی طرف موڑ دیا۔ اگلے لمحے سِتار کے پردوں سے نغمات کا ایک رنگا رنگ دریا بہنے لگا اور حمیدہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چِق سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ حمیدہ کے پیچھے پیچھے تمام لڑکیاں چِق سے چمٹ گئیں۔ میں نے چِق کے ایک گوشے سے دیکھنا چاہا کہ اس فردوسِ گوش کا خالق کون ہو سکتا ہے؟ اور کیا دیکھتا ہوں کہ سِتار کو گلے سے لگائے یوسف تخت پر بیٹھا ہے۔ جی ہاں وہی میرا اکم ذات اور کم شکل دوست یوسف، مگر بخدا یوسف اور سِتار باہم مل کر مجسم حسن و جمال بن گئے تھے۔ کچھ اسی قسم کا حسن جو ستارۂ صبح کی لاٹ میں ہوتا ہے، جو شبنم سے لدے پھول میں ہوتا ہے، جو معصوم بچّے کے دلگداز تبسّم میں ہوتا ہے۔ الغرض وہی حسن جو چند لمحے پہلے مجھے حمیدہ کے گلگوں لب و عارض میں دکھائی دیا تھا۔۔ اور ہاں، حمیدہ چِق سے لگی ہے خود کھڑی تھی جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔ حمیدہ کی سہیلیوں کی کھُسر پھُسر جاری تھی۔

"یہ سِتار نواز کون ہے؟"

"یہ بھائی جان کا دوست ہے۔ ان کے ساتھ آیا ہے۔"

"کیا خوبصورت سِتار بجاتا ہے!"

"کس قدر حسین لگ رہا ہے۔"

مجھے شک ہوا کہ یہ آخری جملہ حمیدہ کے منہ سے نکلا تھا۔

آواز آئی "حمیدہ ذرا دیکھو۔ تم بھی سِتار بجاتی ہو۔"

"اری، یہ تو سِتار بھی حمیدہ کی ہے۔"

"یہ سِتار ایسے ہی سِتار نواز کے قابل ہے"۔

"اللہ قسم، حمیدہ، تمہاری سِتار ہی نہیں تم خود بھی۔۔۔"

یہ کہ کر لڑکی نے میری طرف دیکھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ہم نے بادل ناخواستہ جملہ مکمل کر لیا۔۔۔ اور پھر دِل کو پکڑ کر بیٹھ گئے، ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔

جتنی دیر یوسف سِتار بجاتا رہا۔ حمیدہ کی محویت کا یہ عالم تھا کی کسی چکور نے چاند کو اس وارفتگی سے نہ دیکھا ہو گا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یوسف سِتار کے تاروں کی بجائے حمیدہ کے دِل کے تار چھیڑ رہا ہے۔ موسیقی ختم ہوئی تو تالیوں کی گونج میں لڑکیوں نے مطالبہ کیا کہ یوسف کو زنانے میں بھیجا جائے۔ یوسف آیا اور اپنے ساتھ اپنی گفتگو کا زعفران زار بھی لایا۔ ادھر سب سے پہلے حمیدہ نے یوسف کو سلام کیا۔ یہ منظر دِل

محزوں سے برداشت نہ ہو سکا اور اپنے روئے زیبا کی روشنی میں چِق اُٹھاتے ہوئے دیوان خانے میں آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد خان صاحب کھانے کا واسطہ دے کر بمشکل یوسف کو باہر لائے لیکن کھانے پر بھی سب نگاہیں یوسف ہی پر مرکوز تھیں۔ گویا یوسف نوالے نہیں چبا رہا، ستار بجا رہا ہے۔ جو کچھ دستر خوان پر آیا یوسف کے آگے ڈھیر کر دیا گیا۔ کیا مجال جو کوئی سبزی کوئی ترکاری یوسف کو خراج ادا کئے بغیر ہم تک پہنچے، بلکہ ایک ایک چپاتی کے لئے جانا پڑا ارقیب کے گھر پر ہزار بار۔ ویسے یوسف ہمارے لئے بے شک سراپا تشکّر تھا لیکن اسے کیا معلوم کہ اب ہم تشکّر کے تشنہ نہ تھے۔ حمیدہ کے حاجت مند تھے۔

کھانے کے بعد کی کہانی مختصر ہے۔ رخصت ہونے لگے۔ تو خان صاحب نے یوسف کا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے کہا۔

”یہ ابھی چند روز یہیں ٹھہریں گے۔ آیئے آپ کو سٹیشن پر چھوڑ آؤں۔“

پلیٹ فارم پر خان صاحب مجھے خدا حافظ کہہ کر جانے والے تھے کہ میرے ڈبّے کے ایک اور مسافر نے انہیں دیکھ لیا اور گاڑی سے اُتر کر ان سے تپاک سے مصافحہ کیا۔ جب گاڑی چل پڑی تو میں نے ہم سفر سے پوچھا:

”آپ خان صاحب کو جانتے ہیں؟“

بولا: ”انہیں کون نہیں جانتا؟ مہاراجہ بانڈی پور کے درباری گویّا ہیں؟“

# مصنّف بیتی

## آخری تحریر؟ غالباً

میں نے دو کتابیں پہلے لکھی ہیں: بجنگ آمد اور بسلامت روی۔ یہ کتاب۔۔۔ بزم آرائیاں۔۔۔ تیسری اور آخری ہے۔ غالباً! بعض دوستوں کا خیال ہے کہ پطرس کی طرح مجھے بھی پہلی کتاب کے بعد کچھ نہیں لکھنا چاہئے تھا۔ مجھے اس خیال سے اتفاق ہے۔ دوسری کتاب لکھنا شاید غلطی تھی، لیکن اب کہ غلطی ہو چکی ہے۔ پچھتانے بیٹھ جانا بھی کوئی فرحت بخش مشغلہ نہیں۔ اس سے بہتر شغل تو اس غلطی کا جواز ڈھونڈتا ہے اور وہ اس باب میں آگے چل کر ڈھونڈا جائے گا۔ فی الحال ذرا مصنّف بیتی کی چند جھلکیاں۔

بجنگ آمد کا موضوع میری لفٹینی تھی، یعنی یہ کہ کب اور کیسے نازل ہوئی اور بعد از نزول مجھ پر کیا گزری۔ بسلامت روی سفر فرنگ کی روداد تھی۔ موجودہ کتاب جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے لیکن اس الوداعی باب میں یہ بتانا مقصود ہے

کہ جب ایک روز یہ خاکسار یکایک ایک عام آدمی سے مصنّف بن گیا تو اس کے بعد اس پر کیا بیتی۔

## بکرا ہو مصنّف ہو کچھ فرق نہیں پڑتا

لفظ "بیتی" سے یہ نہ سمجھیں کہ مجھ پر کوئی ایسا ظلم ہوا جو اوروں پر نہیں ہوا تھا۔ نہیں، ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ فقط یہ کہ مجھے علم نہ تھا کہ اگر ایک سیدھا سادا امن پسند شہری جاتے جاتے مصنّف بن جائے تو وہ بھی فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی طرح پبلک پراپرٹی یا (پٹواری کی زبان میں) "شاملاتِ دہ" بن جاتا ہے۔ یعنی جس نے چاہا بڑھ کر ہاتھ میں اٹھالیا۔ پسند آیا تو سر پر دستِ شفقت پھیر دیا۔ پسند نہ آیا تو پاؤں پر پائے حقارت رکھ دیا۔ فلم ایکٹروں اور خصوصاً ایکٹریسوں کا تو یار لوگ فیتوں، خوردبیوں اور ایکس رے کے ذریعے خاصا دوررس طبّی معائنہ کر ڈالتے ہیں جس سے ایک اوسط درجے کے مصنّف کو نہیں گزرنا پڑتا۔ لیکن ایک مصنّف کو بھی خصوصاً ایک نئے مصنّف کو نقّاد لوگ خاصا اُلٹ پلٹ اور ٹوہ ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ یعنی مصنّف تقریباً اسی عمل سے گزرتا ہے جس سے ایک لاغر بکرا قصائی کے ہاتھوں سے گزرتا ہے۔ بہت کم بکرے اور مصنّف گزرے ہیں جو اپنے ٹوہنے ٹٹولنے والوں کے ہاتھوں ذبح ہونے سے بچ سکے۔

چنانچہ بجنگ آمد کو چھپے بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس پر بھی اخباروں، رسالوں اور خصوصاً قارئین کے خطوط میں حاشیہ آرائی ہونے لگی اور جیسا کہ ناگزیر تھا، تبصروں میں کچھ پھول تھے اور کچھ پتھر۔ میں حتیٰ الامکان پھولوں کی تفصیل سے پرہیز کروں گا البتہ پتھروں کے چند نمونے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ دراصل یہ بہت بڑے مہلک پتھر تو نہ تھے، چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے کنکر یا بنٹے تھے مگر پھول بہرحال نہ تھے۔

## ڈھرررا و بھیڈے۔۔۔

اگر آپ نے بجنگ آمد کا دیباچہ پڑھا ہے تو آپ کو علم ہو گا کہ اسے شروع کرتے وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں کوئی مصنّف قسم کا آدمی ہوں حتیٰ کہ پہلے دس باب اسی لاعلمی میں لکھے گئے۔ ان دِنوں لکھنا میرا پیشہ ہی نہیں، شغل بھی نہ تھا۔ بس منہ زبانی باتوں میں کٹ رہی تھی۔ اور وہ بھی بیشتر انگریزی میں کہ یہی فوج کی زبان تھی۔ وہ تو کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دفعہ ایک ایڈیٹر[۳۲] دوست کے اُردُو رسالے کو فاقوں کا سامنا تھا۔ وہ پیشہ ور ادیبوں سے مایوس ہو کر میرے پاس آئے اور مٹھی بھر آٹے یعنی ایک چھوٹے سے مضمون کی فرمائش کی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے آپ کی کار سٹارٹ

---

[۳۲] کرنل مسعود احمد۔ اس وقت ہلال کے مدیر تھے۔

نہ ہو تو آپ ایک مریل سے راہرو سے بھی دھکے کی درخواست کر دیتے ہیں۔ تو ہم نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ کر اپنے دوست کے رسالے کو پہلا دھکا دیا اور پھر وقفے وقفے سے نو مزید دھکے دیئے۔ دسویں دھکے کے بعد شفیق الرحمان کا ٹیلی فون آیا کہ دیکھو میاں تم جو کوئی بھی ہو آج سے ہمارے دوست ہو اور خوشخبری تمہارے لئے یہ ہے کہ تم مصنّف بن سکتے ہو۔ بس دس باب اور لکھ ڈالو۔ پھر یہ کتاب بن جائے گی اور تم مصنّف۔

اب یہ کہ ہم سچ مُچ مصنّف بن سکتے ہیں، ہمارا فوجی ذہن مانتا نہیں تھا، لیکن ادھر مشیر ثقہ تھے۔ فوجی ہونے کے باوجود کئی دلکش اور دلکشا کتابوں کے خالق تھے۔ سو ہم نے گیارہواں باب، بلکہ باقی سارے باب، لکھتے وقت اندر خانے محسوس کرنا شروع کیا کہ مصنّفی کر رہے ہیں اور آخر سچ مچ شفیق الرحمان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ یعنی ایک دن ناشر نے کتاب لا کر ہمارے ہاتھ پر رکھ دی۔ سرورق کی پیشانی پر کتاب کا نام تھا اور نیچے ہمارا اپنا نام دیکھا تو خوشی میں ہمارے منہ سے وہی بات نکلی جو ہمارے گاؤں کے گڈریے نے اپنی منگنی کے بعد ترنگ میں آکر اپنی بھیڑ سے باآوازِ بلند کہی تھی۔

”ڈھرررا او بھیڈے، یار منگائے گئے نی“[۳۳]

---

[۳۳] چل میری بھیڑ۔ یاروں کی منگنی ہوگئی ہے۔ گڈریے بھیڑوں کو ہانکتے وقت ڈھرر کی آواز نکالتے ہیں۔ اس کے صحیح تلفّظ کے لئے کسی چکوال کے آدمی سے رجوع کریں۔

# اے اللہ مجھے لطف لیتا معاف کر

لیکن اب ہمیں ایک اور خوف ستانے لگا کہ ٹھیک ہے۔ کتاب تو چھپ گئی مگر اسے کوئی منہ بھی لگائے گا یا نہیں اور کسی نے پڑھ بھی لی تو پڑھنے کے بعد کلمۂ خیر کہے گا یا کوئی دوسری قسم کا کلمہ۔ بعینہ ایسے ہی جیسے ہمارے گڈریئے دوست کے دِل میں منگنی کے بعد کبھی یہ وسوسہ اُٹھا ہو کہ وہ نیک بخت سچ مُچ شادی بھی کرے گی یا مُکر جائے گی۔ بہرحال گڈریئے کے ساتھ تو جو کچھ ہوا وہ جانے۔ ہماری شادی، قارئین کے ساتھ، سچ مُچ ہو گئی اور بڑی دھوم دھام سے۔ بلکہ اتنی غیر متوقّع دھوم دھام سے کہ دولھے کا دِل ذرا سہم سا گیا۔ ہوا یہ کہ کتاب چھپتے ہی شفیق الرحمان مبارک باد لے کر آ گئے۔ سید ضمیر جعفری ہار لے کر پہنچے۔ کراچی سے ابنِ انشا نے پھول بھیجے۔ مشتاق یوسفی نے ثمر پھینکے۔ لاہور سے محمد خالد اختر نے ایک چمکیلی سی شاباش بھیجی اور سیّد عابد علی عابد تو ایک اونچا سا بانس لے آئے اور ہماری انگلی پکڑ کر اس پر چڑھانے کی کوشش کی، بدیگر الفاظ ایک دہشت زدہ فوجی کی پیٹھ اس زور سے تھپکائی گئی کہ اسے شاباش پر سینہ پھُلانے سے زیادہ پیٹھ سہلانے کی پڑ گئی حتیٰ کہ غریب نے آخر خدا سے ایک خفیہ دعا مانگی۔

"اے اللہ ان سب مہربانوں کو اس مبالغے کے لئے معاف فرما جو انھوں نے میرے حق میں کیا ہے اور مجھے وہ لطف معاف کر جو میں نے ان مبالغوں سے اٹھایا ہے۔"

بجنگ آمد کی اشاعت کے بعد بے شمار کھٹ مٹھے واقعات پیش آئے۔ ہمارے ساتھ شامیں منائی جانے لگیں جو ہمارے اناڑی پن سے روٹھ روٹھ جاتی تھیں۔ ادبی تقریبات کی کرسئ صدارت پیش کی جانے لگی جس پر بیٹھنے کا ہمیں صحیح ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ قوّالیوں کی محفل میں شمولیت کے پیغام آنے لگے جن میں جھومنے کی ہمیں مشق نہ تھی۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی مگر خاصی مستقل مزاج سی فین میل شروع ہو گئی، جس میں کچھ قیامت کے نامے بھی آنے لگے۔ الغرض کتاب تو ہم نے ناعاقبت اندیشی کے ریلے میں لکھ ڈالی تھی لیکن اس کے عواقب، یعنی اُن شاموں، صدارتوں اور قوّالیوں، کے لئے کوئی دفاعی تیاری نہیں کی تھی۔ بے شک قدرت نے ہمیں شہرت کے آسمان پر ٹمٹمانے کا موقع تو بخش دیا تھا لیکن سلیقہ نہیں بخشا تھا۔ نتیجہ یہ کہ دور سے تو ہم چھٹی ساتویں کے چاند نظر آنے لگے، مگر جس کی نے ازراہِ متجسّس ہمیں قریب سے آکر دیکھا، ہمیں اصلی چاند کی طرح راکھ اور راک (Rock) کا ڈھیر پایا اور ایک آدھ مزید پتھر پھینکے بغیر نہ گزرا۔۔۔ ایک واقعہ بھولنے کا نہیں:

## ہائے میں مر گئی۔۔۔

بجنگ آمد کو شائع ہوئے بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ راولپنڈی کے ایک معروف ادارے نے ہمارے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا۔ اب پنڈی کی گلیوں میں ہم برسوں سے گھوم رہے تھے لیکن عام گمنام سپاہیوں کی طرح۔ حلقۂ یاراں میں ہماری بزم

آرائیاں اپنی جگہ لیکن باہر کی دنیا میں اوّل تو ہمیں کوئی جانتا ہی نہ تھا اور جو دور سے پچانتے تھے، ہمیں بالکل بیبا، بلکہ بے زبان سا آدمی سمجھتے تھے۔ لیکن شاید بجنگ آمد کی روسے ہماری تاثیر کچھ مختلف تھی۔ ہال میں پہنچ کر حاضرین کی طرف منہ کر کے سٹیج پر بیٹھا ہی تھا کہ پہلی یا دوسری صف کی ایک خاتون کے منہ سے ایک حیرت کے عالم میں پنجابی آواز نکلی جو میرے سمیت کئی دوستوں نے سُنی اور جو آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ محترمہ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا۔

"ہائے میں مر گئی۔ ایہ کتاب ایس گھگو نے لکھی اے۔ اُتوں کِنّا بھولا لگدا اسی تے وِچّوں کِنّا میسنا[34] نکلیا!

یہ تھا پہلا پتھر! ہم خاموش رہے کہ حملہ آور خاتون تھی اور اسے یہ بھی نہ کہہ سکے کہ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔ یہ دوسری بات کہ جب صحبت رہنے لگی تو اس نیک دِل خاتون نے اپنا جملہ بکمال ندامت واپس لے لیا اور فرمایا: "بحمد اللہ تم اتنے بھولے نہیں جتنا مجھے شک تھا۔ لیکن اس پرائیویٹ معذرت سے وہ بھری محفل کا گھاؤ تو بھرنے کا نہیں تھا اور آج تک نہیں بھرا۔

---

[34] ہائے میں مر گئی۔ یہ کتاب اس بدھو نے لکھی ہے۔ یہ باہر سے کتنا بھولا لگتا تھا مگر اندر سے بڑا گھُنا نکلا۔

## وہ آئیں گھر میں ہمارے۔۔۔۔

اس واقعہ سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک شام غریب خانے پر ایک پتلے کینڈے، چھدری داڑھی اور مفتی حلیے کے شیروانی پوش بزرگ تشریف لائے اور ایسے لب و دنداں کے ساتھ جو ایک ہی لمحہ پہلے پان سے فارغ ہوئے ہوں، بلکہ ان کی داڑھ مع داڑھی جگالی کی آخری حرکات سے گزر رہی تھی۔ میں باہر صحنِ چمن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر استفسار فرمایا:

"کرنل محمد خاں گھر پر ہی ہیں؟"

میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور ادب سے کرسی پیش کرتے ہوئے بولا:

"تشریف رکھیں۔ میں ہی محمد خاں ہوں۔"

غالباً مجھے کرتے شلوار میں دیکھ کر سکتے میں آ گئے اور بیٹھے بغیر بولے:

"گویا آپ ہی کرنل محمد خاں ہیں؟"

عرض کیا۔ "ہاں" مگر یوں لگا جیسے کسی جرم کا اقبال کر رہا ہوں۔

بولے۔ "تو کرنل لوگ فوجی وردی نہیں پہنا کرتے؟"

عرض کیا۔ ”پہنتے ہیں مگر ایک وقت آتا ہے جب اتار بھی دیتے ہیں، مثلاً گھر آکر۔“

بولے۔ ”معاف کرنا صاحب۔ آپ کے متعلق میرا تصوّر ذرا مختلف تھا۔ میرا مطلب ہے ذرا جلال والے انسان کا۔“

اب کتنی ہی خاکساری کروں، ایک بات واضح تھی کہ جلال کی مقدار مجھ میں ہر چند کہ کم تھی۔ مولانا سے دو چار ماشے زیادہ ہی تھی۔ لیکن سوال میرے اندازے کا نہیں، مولانا کی رائے کا تھا جو میری جگہ جلال سے لت پت آدمی دیکھنا چاہتے تھے۔

بہرحال پوچھا:

”قبلہ تو کیا مجھ میں جلال کی کمی ہے یا انسانیت کی قلت دکھائی دی ہے؟“

اس سوال کے جواب میں محترم صرف مسکرادئے اور آپ کی مسکراہٹ صاف کہہ رہی تھی کہ ہر دو کا قحط ہے۔ آپ کی مسکراہٹ کی صاف گوئی نے دِل جیت لیا۔

عرض کیا:

”لائیے ہاتھ مولانا۔ آپ کی تعریف؟ اور ہاں چائے یا کافی؟“

بولے: ”شربت روح افزا ٹھیک رہے گا۔ اور ہاں خاکسار کو مولانا نہیں، میر نجیب اللہ کہتے ہیں۔ احباب میر نجو پکارتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے سے خاندانی شغف ہے۔ میں بھی کتاب لکھنے کا عزم کر رہا ہوں۔“

مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ میر صاحب کے عالمِ بالا میں مکمل سکون نہیں، مگر اس تھوڑی سی بالائی بدامنی کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ آدمی نظر آنے لگے۔ مہمان کی تواضع بہرحال لازم تھی چنانچہ میر صاحب کو بازو سے تھام کر کرسی پر بٹھایا۔ ان کے لئے شربت منگایا اور باتیں ہونے لگیں۔ لیکن خدا جانے میری باتوں کے لہجے درست نہ تھے یا میرے کرتے شلوار سے ناخواندگی ٹپکتی تھی، میر نجو مجھ سے کچھ متاثر نہیں ہو رہے تھے۔ صرف کبھی کبھی سرپرستانہ ہنسی ہنس دیتے۔ بہرحال جب باتوں باتوں میں بے تکلّفی کی ایک دو منزلیں طے ہو چکیں تو میر صاحب نے اچانک فرمایا:

”بندہ پرور ایک بات پوچھوں؟“

”ارشاد۔“

”آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟“

”آپ بِلا تکلّف پوچھیں۔“

”بجنگ آمد آپ نے خود لکھی ہے؟“

اب اگر یہی سوال کوئی ہوش مند شخص پوچھتا تو ہم نہ صرف بُرا مانتے بلکہ اسے اس کی ہوش مندی سمیت اُٹھا کر قریب کے گڑھے میں پھینک دیتے۔ مگر میر صاحب کی نیّت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ وہ نہایت دیانتداری سے ہمیں بدھو سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ عرض کیا۔

"میر صاحب آپ نے راز کی بات پوچھ ڈالی ہے۔ کسی کو بتایئے گا تو نہیں؟"

بولے: "آپ کا راز میرا راز ہے۔"

اور یہ کہہ کر کان میرے منہ کے قریب لے آئے۔ پہلے تو جی چاہا کہ نیچے سے گھاس کا تنکا اُٹھا کر ان کے کان میں تیز اور گہری گدگدی کروں لیکن بے تکلّفی اس حد تک بھی نہیں بڑھی تھی۔ میں نے ایک مدھم سے سازشی لہجے میں ان کے کان میں کہا۔

"ایک جگہ سے لکھوائی تھی۔"

سرگوشی میں بولے: "کہاں سے؟"

میں نے ذرا زیادہ گہری سرگوشی میں جواب دیا۔

"ادارہ خدمتِ خلق سے۔"

میر صاحب ایک لمحے کے لئے سیخ پا سے ہو گئے اور بولے۔

”صاحب تمسخر کرتے ہیں مجھ سے؟ اس ادارے کا کام تو گم شدہ بچّے ڈھونڈنا ہے۔“

عرض کیا۔ ”بے شک۔ یہ لوگ بچّے ہی ڈھونڈتے ہیں مگر جب سب بچّے مِل جائیں تو پھر حاجت مندوں کے لئے کتابیں بھی لکھتے ہیں۔ یہ بڑے مخیّر لوگ ہیں میر صاحب یہ تمسخر کی بات نہیں۔“

میر صاحب بولے: ”چلو مخیّر سہی، لیکن کیا بچّے ڈھونڈنے والے کتابیں بھی لکھ سکتے ہیں؟“

عرض کیا۔ ”میر صاحب قبلہ یہ ادارہ فقط وہ کارکن بھرتی کرتا ہے جو نہ صرف خدمتِ خلق میں یکتا ہوں بلکہ علم و ادب میں بھی یگانہ ہوں۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ راولپنڈی اسلام آباد کے ادارہ خدمت میں حضرت جوش ملیح آبادی، سید ضمیر جعفری اور جناب ممتاز مفتی جیسے بزرگ شامل ہیں اور یہ بڑے باکمال لوگ ہیں میر صاحب۔ یہ بچّے ڈھونڈنے پر آئیں تو آنکھیں بند کر کے اندھیری کوٹھڑی سے کچھ نکال لاتے ہیں۔ اور کتابیں لکھنے لگیں، خصوصاً دوسروں کے لئے تو گنڈیریوں کی طرح شاہکار گھڑتے، ڈھیر لگاتے چلے جاتے ہیں۔ کاش آپ نے میری بات کو مذاق نہ سمجھا ہوتا۔“

یہ جملے ہمارے منہ سے اس فوجی سادگی سے نکلے کہ میر صاحب دام میں آ گئے۔

جھٹ بولے۔

"سبحان اللہ کیا ایثار پیشہ لوگ ہیں یہ تینوں۔ آپ کی کتاب تو سید ضمیر جعفری نے لکھی ہو گی؟"

"اللہ جانے، میر صاحب تین میں سے کسی ایک نے لکھی ہے۔ لکھی کیا ہے، نیکی کر کے دریا میں ڈال دی ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔"

"ماشاء اللہ۔ اور ہاں بھلا کیا ہدیہ لیتے ہوں گے ایک کتاب لکھنے کا؟"

میر نجو کی بلّی نے تھیلے سے پہلی دفعہ جھانکا۔ آپ کا کتاب لکھوانے کا شوق ایک جھٹکے کے ساتھ بیدار ہوا تھا۔ میر صاحب کتاب لکھوانا، شیروانی سلوانا، حجامت بنوانا، ایک جیسا فعل سمجھتے تھے۔ جواب عرض کیا۔

"میر صاحب ہدیہ تو کتاب کے سائز پر منحصر ہے۔ ویسے ناداروں یتیموں اور بیواؤں کو وہ مفت بھی لکھ دیتے ہیں۔"

میر صاحب جھٹ بولے: "یہ تو اور اچھا ہوا۔ والد صاحب قبلہ اوائل عمری میں وفات پا گئے تھے۔"

میر صاحب نے صراحت تو نہ کی لیکن ظاہر تھا کہ ان کے والد اپنی عمر کے اوائل میں نہیں بلکہ میر صاحب کی اوائل عمری میں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ بہر حال وہ اپنی یتامت کے سہارے اپنی ELEGIBILITY ثابت کر رہے تھے۔

عرض کیا: ”جی ہاں۔ اگر آپ دادا جان کی رحلت بھی حساب میں لے لیں تو ڈبل یتیم شمار ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی ضرورت نہیں۔ سادہ اور منفرد یتامت ہی کافی ہے۔ صرف اس کی تصدیق درخواست کے ساتھ نتھی کرنا ہو گی۔“

میر نجو چہک کر بولے: ”یہ کوئی پرابلم نہیں۔ کمیٹی کے دفتر میں ایک کلرک میرا واقف ہے۔ معمولی رشوت لیتا ہے۔“

میر صاحب نے یہ کہا اور پھر اس تیزی سے اٹھے گویا اگلے چند لمحوں میں درخواست لکھ کر کمیٹی سے پروانۂ یتیمی لے کر ادارے کا دروازہ توڑ کر جوش صاحب کے ہاتھ میں قلم تھما کر کتاب شروع کرا دیں گے۔ بہر حال میر نجو تو اپنی کمزوری کا شکار ہو گئے لیکن شکار ہونے سے پہلے ہماری کمزوریوں کو بھی بڑی بے رحمی سے بے نقاب کر گئے اور یہ بھی واضح فرما گئے کہ ہم اس کتاب کے مصنّف ہونے کے قابل نہ تھے جو خود ہم نے لکھی تھی۔ بلکہ ملاقات کے آخر میں اگر ان کے رہوارِ وحشت کا رُخ جوش صاحب کی طرف نہ موڑ دیتے تو ذرا اور زیادہ روند کر ہی رخصت ہوتے۔ یہ تھا دوسرا پتھر!

## تصویر تری دِل مرا بہلا نہ سکے گی

تیسرا پتھر چند روز بعد نازل ہوا۔ جیسا کہ احباب جانتے ہیں، بجنگ آمد میری فوجی آپ بیتی ہے اور یہ قصّہ ہے ان دنوں کا جب آتش جوان ہی نہیں، کپتان بھی تھا، مگر یہ قصّہ

رقم ہوا کوئی بیس بائیس برس بعد، لیکن جب آتش جوانی کے ماہ و سال گزار کر ادھیڑ سا کرنیل ہو چکا تھا۔ لیکن کتاب کے مزاج کے پیشِ نظر اس میں تصوّرِ ایّامِ جوانی اور عہدہ کپتانی ہی کی شامل کی گئی تھی۔ جو موجودہ آتش سے خاصی غیر مشابہ تھی۔ یہ تھا پس منظر اور ملاقات ہو گئی ایک رنگین سی مخلوط پارٹی میں ایک ایسی خاتون سے جو مرصع بھی تھی اور مجلّا بھی، اور مشتاقِ دید تھی مصنّف بجنگ آمد کی، جس کی تصویر کو تنہائی میں سو سے سو نمبر دے چکی تھی لیکن جونہی خاتون کو قریب لا کر بتایا گیا کہ یہ ہے وہ شخص جس کی آپ کو جستجو ہے تو ہمیں دیکھ کر موصوفہ کو اس قدر واضح دھچکا لگا کہ ان کے ذہنی زلزلے کی لہریں ہمسایہ ممالک میں محسوس کی گئیں، بلکہ پہلے خود ہم سے کرائیں۔ لیکن ہم نے جلد ہی سنبھل کر وہ رسمی کلمہ دہرایا۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی۔"

اُدھر سے ارشاد ہوا: "لیکن آپ کو دیکھ کر تو بڑی مایوسی ہوئی ہے۔"

ہمارے لئے شاید یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا لیکن ہم ایک نا معلوم تنکے کے سہارے تیرتے رہے اور عرض کیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں مگر کسی قصور کی نشان دہی فرمائیں گی؟"

آپ نے ڈٹ کر فرمایا "ضرور۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ کی کتاب میں تصویر دیکھ کر ایک خواب آیا تھا۔ آج تعبیر دیکھی تو سارا خواب پریشان ہو گیا۔ کہاں وہ سمارٹ اور جوان کپتان اور کہاں یہ۔۔۔"

خوش قسمتی سے آپ یہاں پہنچ کر رُک گئیں۔ عرض کیا۔

"جملہ نامکمل رکھنے کا شکریہ اور آپ کو مایوس ہونے کا بھی پورا حق ہے لیکن کیا آپ چند نمبر اس بات کے نہیں دیں گی کہ وہ سمارٹ تصویر بھی اس خاکسار کی ہے؟ اور کیا آپ اس بات پر بھی غور نہیں فرمائیں گی کہ بائیس سال گزرنے کے بعد بھی چہرے پر سمارٹ کپتانی طاری رکھنا ممکن نہ تھا۔"

محترمہ بدستور مائلِ جارحیت تھیں۔ فرمایا۔

"تو پھر اس سمارٹ تصویر کو خاندانی البم یا تاریخی میوزیم میں رکھ دیا ہوتا۔ کتاب میں جڑنے کی کیا تُک تھی؟ یہ تو صریح دھوکہ ہے۔"

"دھوکہ؟ محترمہ، تصویر سے مدعا محض تعارف تھا تلاشِ رشتہ نہ تھا۔"

بیگم صاحبہ ذرا جھینپیں لیکن پھر ایک روائتی زنانہ آمریت کے ساتھ فیصلہ کُن انداز میں بولیں۔

”بہر حال مصنّف کو کتاب میں اپنی LATEST (سب سے آخری) تصویر دینا چاہیے۔“

عرض کیا: ”محترمہ انسان کی سب سے آخری تو عالمِ نزع کی تصویر ہی ہو سکتی ہے، اور وہ تصویر ایسی قابلِ دید نہیں ہوتی“۔

بولیں: ”تو یوں کہیں نا کہ آپ کو قابلِ دید بننے کی فکر کھائے جارہی تھی۔“

عرض کیا: ”بالکل کھائے تو نہیں جارہی تھی لیکن قابلِ دید ہونے میں حرج ہی کیا ہے؟“

”بہت سخت حرج ہے۔ آخر انسان دوسرے انسانوں کے سامنے اسی روپ میں کیوں نہ آئے جیسا کہ وہ ہے؟“

”مثلاً آپ کی طرح؟“

”ہاں میری طرح۔“

”مگر اس وقت آپ وہ تو نہیں جیسے کہ دراصل ہیں۔ مثلاً جیسے کبھی باروچی خانے سے مولی کترا اٹھائے، منّے کو کہنی سے لٹکائے، آستین سے ناک پونچھتے اور آنکھیں ملتے باہر

نکلتی ہیں۔ اس وقت تو آپ ماشاء اللہ کوئی تھان بھر جاپانی جارجٹ، کان بھر افریقی سونا اور ٹین بھر فرانسیسی عطر اٹھائے ہوئے ہیں۔"

خلافِ توقع، موصوفہ نے ہمارے طرز کو داد تصوّر فرمایا اور مسکرا کر کہا۔

"ٹھیک ہی تو ہے۔ پارٹی میں کوئی کچن کے کپڑوں میں تھوڑا ہی آتا ہے۔"

عرض کیا: "تو خاتونِ محترم کتاب لکھ کر میں بھی پارٹی میں شامل ہو رہا تھا۔ اپنے قارئین کی پارٹی میں۔ پھر کتاب ذرا کمزور تھی، لہٰذا یہ کمی ایک سمارٹ سی تصویر سے پوری کرنے کی کوشش کی۔ اسے یوں سمجھ لیں جیسے کوئی خاتون چہرے کی کمزور ہو تو میک اپ اور گہرا کرتی ہے۔"

ہمارا یہ کہنا تھا کہ محترمہ حاضرین سے معذرت کیے بغیر تیزی سے اس کمرے کو چل دیں جس میں ایک قدِ آدم آئینہ رکھا تھا۔ ادھر ہم نے ایک تنکے کے سہارے بمشکل کنارے پر قدم رکھا اور ایک لمبا سانس لیا۔ تیسرے پتھر سے مرتے مرتے بچے تھے!

خدا جانے قارئین (خصوصاً خواتین) مصنّف سے اچھا مصنّف ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت سا لونڈا ہونے کی توقع کیوں رکھتی ہیں؟ اس ضمن میں مشتاق احمد یوسفی ایک لطیفہ سناتے ہیں۔ کہنے لگے ایک روز ایک جسیم اور خوش رنگ سی بیگم ہمارے گھر تشریف لائیں اور ہماری بیگم کے سامنے ہماری اور ہماری کتابوں کی تعریفیں کرنے

لگیں۔ ہماری بیگم نے بڑے فخر کے ساتھ ہمارے قصیدے سُنے۔ اتنے میں ہم باہر سے آ گئے تو ہمیں دُبلا پتلا اور کسی قدر سانولا دیکھ کر ہماری بیگم سے پوچھنے لگیں۔

”یہ کون ہے؟“

بیگم نے بڑے فخر سے جواب دیا: ؟”یہی تو میرے میاں ہیں۔“

مہمان بیگم نے کسی قدر حیرت سے پوچھا: ”تو کیا آپ کے میاں بنگالی ہیں؟“

ہماری بیگم بولیں ”نہیں تو۔“

اس پر مہمان بیگم نے ازراہِ ہمدردی فرمایا۔

”چلیں شُکر کریں، مسلمان تو ہیں۔“

پیش رفتہ مکالمے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اگر سانولے رنگ کے پاکستانی مصنّفین کو خوش رنگ بیگمات کے حلقے میں اپنی ساکھ قائم رکھتا ہے تو انہیں مسلمان ہونے کے علاوہ اپنے میک اپ کا معقول انتظام کرنا ہو گا۔ ہر چند کہ انہیں ان کی مسلمانی کے بھی کچھ نمبر مل جائیں گے تاہم اتنے نہیں کہ ان کی سانولاہٹ کا خسارہ پورا ہو سکے۔ یعنی فیل نہ بھی ہوئے تو بمشکل تھرڈ ڈویژن ہی حاصل کر پائیں گے۔ اعلیٰ نمبروں کے لئے اوّلین شرط

خوشخطی ہے، خواہ املا میں چند غلطیاں بھی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں ان بیگمات کے نزدیک ایک مثالی مصنّف کو گورے رنگ کا بانکا سا گھبرو ہونا چاہیے۔

گویا وہ کوئی نو مسلم انگریز ہو تو بہتر ہے ورنہ انگریز نما مسلمان ضرور ہو لیکن کالا مسلمان؟ نامنظور! اب یہ دوسری بات ہے کہ خود انگلستان میں میمیں ان سانولے سلونے پاکستانی یوسفیوں پر جان چھڑکتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں اگر یہ میمیں زرگزشت[۳۵] بھی سمجھ سکیں تو خدا جانے اور کیا چھڑک دیں۔

## قطرے سے بریگیڈیئر ہونے تک

۱۹۶۶ء میں پہلی دفعہ بجنگ آمد چھپی تو ناشر نے ہمیں چند جلدیں پیش کیں جو ہم نے احباب میں تقسیم کر دیں۔ میجری اور فرنٹیر کور کے زمانے کے ہمارے ایک تیز رو ساتھی میجر رفیع تھے جو اب میجر جنرل ہو کر صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹیری بن گئے تھے۔ انہیں فون پر بتایا کہ ایک جلد آپ کے نام کی رکھی ہے۔ بتائیں، کب اور کہاں بھیجوں۔ بولے اسی وقت اور یہیں دفتر میں بلکہ خود لے کر آؤ گپ بھی رہے گی۔ اور ہاں ایک فالتو جِلد بھی ہو تو لیتے آنا۔ شاید پریزیڈنٹ صاحب بھی پڑھنا چاہیں۔

---

[۳۵] زرگزشت۔ مشتاق احمد یوسفی کا مزاحیہ شاہکار۔

میں نے ایک اور جِلد بھی لے لی اور جا کر دونوں کتابیں جنرل رفیع کی میز پر رکھ دیں۔ گپ شروع ہوئی مگر ابھی چل نہ نکلی تھی کہ فون پر صدر نے جنرل رفیع کو اندر بلا لیا۔ رفیع اندر جاتے ہوئے ایک جِلد کتاب کی بھی ساتھ لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوٹے تو ناتمام گپ کو جاری رکھنے کی بجائے کہنے لگے۔

"پہلے اندر جاؤ، پریذیڈنٹ صاحب بلا رہے ہیں۔"

اب فوجی افسروں کے لئے سربراہِ مملکت سے ملنے کے لئے چند کڑے آداب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلا لازمہ تو یہ ہے کہ لباس درست ہو۔ فوج میں لباس کی نادرستی (TO BE INCORRECTLY DRESSED) ننگا پھرنے سے قدرے زیادہ سنگین تصوّر ہوتی ہے۔ چنانچہ صدر کے فوجی ملاقاتوں کے لئے لازم ہے کہ بے داغ سروس ڈریس پہن رکھی ہو جس کا ہر مربع انچ کسی مشّاق دھوبی یا دھوبن کی گزشتہ رات کی عرق ریزیوں کی شہادت دے رہا ہو اور جس کا ہر ستارہ، بٹن اور بکسوا اردلی نے براسو میں خونِ جگر ملا کر چمکایا ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملاقاتی نے صدر سے آنکھ ملانے کے لئے پوری ذہنی تیاری کر رکھی ہو۔ مگر ادھر یہ حال تھا کہ ہم نے عام کے ڈی[۳۶] پہن رکھی تھی، جس کی شِکنوں سے کسی دھوبی یا دھوبن کی محنتِ شبینہ نہیں ٹپکتی تھی۔ ہمارے ستاروں، بٹنوں اور بکسوؤں کی بے آبی بھی اردلی کے خونِ جگر

---

[۳۶] K.D یعنی خاکی ڈرل۔

سے زیادہ اس کے ضعفِ جگر کی غماز تھی۔ رہی ہماری ذہنی تیاری تو وہ ہمارے لباس سے بھی زیادہ پچکی ہوئی تھی۔ سو جنرل رفیع سے کہا۔

"ذرا میری ٹرن آوٹ دیکھیں۔ ان کپڑوں میں صدر کے سامنے کیسے جا سکتا ہوں؟"

جنرل رفیع آرام سے بولے۔

"تو دوسرے لفظوں میں تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہیں صدرِ مملکت سے ملنے سے انکار ہے۔ ٹھیک ہے میں انہیں بتائے دیتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر چل پڑے۔

"ٹھہریں، ٹھہریں۔" میں چلّایا۔ "آپ اسے انکار کہتے ہیں میں تو۔۔"

"دیکھو میاں" جنرل رفیع نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں کر و یا نہ۔ اور ایک سیکنڈ میں۔ صدر اس سے لمبے انتظار کے عادی نہیں۔"

الغرض اسی پھٹیچر وردی میں اندر گیا اور صدر کو زندگی کا چست ترین سلوٹ پیش کیا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ سلوٹ کی چُستی وردی کی مستی کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن یہ سب میرے وسوسے تھے۔ صدر ایوب کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا دماغ ہی نہ تھا۔ حسبِ معمول بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ کتاب پیش کرنے کا شکریہ ادا کیا۔ مروتاً اسے ایک دو جگہ سے کھول کر دیکھا۔ دو تین چھوٹے چھوٹے سوال پوچھے اور آخر میں مُنّی

سی شاباش دے کر رخصت کر دیا اور شاباش سمیت اس سارے انٹرویو پر دو منٹ لگے یا شاید اڑھائی اور بس۔

دوسرے روز صبح سویرے جی ایچ کیو میں اپنے دفتر آیا اور کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ کمانڈر ان چیف جنرل یحییٰ کے پرائیویٹ سیکرٹری بریگیڈیئر اسحٰق [۳۷] کا ٹیلی فون آیا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ یہ ٹیلی فونی مکالمہ پیش کیا جائے، آئیں ذرا پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

اتفاق سے ان دنوں جی ایچ کیو کے بالائی ایوانوں میں ایک سیکرٹ فائل چل رہا تھا جس میں جنرل یحییٰ کے ایما پر آسمانوں میں ہماری بریگیڈیئری کے مشورے ہو رہے تھے۔ اب تو خیر ہمیں بریگیڈیئری میں وہ کشش نظر نہیں آتی مگر ان دنوں بریگیڈیئر بننے کا امکان خاصا ولولہ خیز تھا [۳۸]۔ چنانچہ ہمیں ہر وقت تجسس رہتا کہ بریگیڈیئری کس مرحلے پر ہے اور ہمارے مہربان بریگیڈیئر اسحٰق کہ راز دروں سے واقف تھے کبھی کبھی فائل میں جھانک کر ہمیں فون پر بتایا کرتے تھے کہ لب بام ابھی کتنے ہاتھ باقی ہے۔ ہمارے دوستوں کو اس کی بھنک ملی تو از راہِ تفنّن ہمیں "بریگیڈیئر صاحب" سے خطاب کرنا

---

[۳۷] بعد میں میجر جرنل۔

[۳۸] اس وقت میری کور میں بلند ترین عہدہ کرنل تھا اور ساری فوج میں بریگیڈیئر گنتی ہی کے تھے۔ یہ تو بعد میں فوج کی توسیع کا نتیجہ ہے کہ آج کل ماشاء اللہ سینکڑوں افسر بریگیڈیئر کے عہدہ پر فائز ہیں۔

شروع کر دیا اور جواب میں ہم ناچار دعا دیتے کہ "جیتے رہو۔" اس صبح بریگیڈیئر اسحٰق کا فون آیا تو اس توقع پر کہ شاید لبِ بام کچھ اور قریب آ گیا ہو ریسیور اٹھایا مگر آج بریگیڈیئر صاحب کا موضوعِ سُخن ذرا مختلف تھا۔ بولے۔

"کمانڈر انچیف کے سامنے ایوانِ صدر کی وہ فہرست رکھی ہے جس میں جناب صدر کے کل کے ملاقاتیوں کے نام درج ہیں۔ ان میں ایک نام کرنل محمد خاں کا بھی ہے۔ کمانڈر انچیف پوچھنا چاہتے ہیں کہ یہ محمد خاں تم تو نہیں ہو؟"

عرض کیا۔: "ہوں تو میں ہی"

اسحٰق بولے: "اچھا آ آ آ۔"

اور فون بند کر دیا۔ اس لمبے "اچھا" میں ایک عجیب حیرت کی چاشنی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ان کا دوسرا ٹیلی فون آیا اور بریگیڈیئر صاحب ہنس کر بولے۔

"دیکھو میاں۔ تم کمانڈر انچیف کی اجازت کے بغیر سربراہِ مملکت سے ملنے چلے گئے۔ ذرا جرح کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

"پہلا سوال! کیوں ملنے گئے تھے؟"

"میں ملنے نہیں گیا تھا۔ خود صدر ایوب نے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔"

”تمہارے پاس کیا گیدڑ سنگھی تھی جو صدر کو شوقِ ملاقات ستانے لگا؟“

”ایک تھی۔ وہ انہیں کو تحفتاً دے دی۔“

”تو کیا باتیں ہوئیں۔“

”حسبِ معمول باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلۂ خیالات کیا، جیسا کہ اس سطح کی ملاقاتوں میں اکثر ہوتا ہے۔“

”کوئی ایسی بات جو کمانڈر انچیف کے نوٹس میں لائی جانا چاہیئے؟“

”جہاں تک مجھے یاد ہے کمانڈر انچیف کی فلاح و بہبود کا سوال زیرِ بحث نہیں آیا تھا۔“

”اگر وہ شک کریں کہ تم نے کوئی غلط بات کہہ دی ہو تو؟“

”تو انہیں یقین دلا دیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے صحیح کہا ہے۔ لیکن ان کے مستقبل کے متعلق کچھ بھی کومٹ[۳۹] نہیں کیا۔“

اس تمہیدی دِل لگی کے بعد بریگیڈیئر صاحب کو میں بات بتائی تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔

---

[۳۹] Commit

”ارے اتنی سی بات ہے۔ یہ تو پیالی میں طوفان آ گیا۔ ٹھیک ہے میں چیف کو سمجھا دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ اسحٰق پھر فون پر تھے۔ بولے۔

”ساری، اولڈ بوائے۔ چیف تمہاری وضاحت سے بالکل مطمئن نہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں ان کا DISPLEASURE CONVEY[40] کر دوں۔“

عرض کیا۔ ”ٹھیک ہے جناب DISPLEASURE سر آنکھوں پر لیکن اس کا اثر کہیں اس فائل پر تو نہ ہو گا جس میں ہماری بریگیڈ ئیری زیرِ تعمیر ہے“۔

بولے۔ ”کہہ نہیں سکتا، مگر بہتر ہوتا اگر تم چند روز ٹھہر کر صاحبِ صدر کو شرفِ ملاقات بخشتے۔“

قصّہ مختصر اگلے روز ہماری بریگیڈ ئیری کا فائل، کمانڈر انچیف کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہماری ان ٹرے میں اشک فشاں اترا۔ کھول کر پڑھا تو آخری سطر میں تین مانوس حروف نظر آئے N.F.A[41] ہم گزشتہ شب سے ہی اس حادثے کے لئے تیار بیٹھے تھے لہٰذا بالکل قابلِ برداشت سی چوٹ آئی۔ چنانچہ N.F.A پر تین حرف بھیجے اور زبیری

---

40 اظہارِ خفگی کے لئے دفتری اصطلاح۔

41 یہ تین حروف مخفف ہیں NO FURTHER ACTION کے۔ یعنی مزید کارروائی ختم کی جائے۔

صاحب سے درخواست کی کہ آج کی چائے کے ساتھ شیز ان کی پیٹیز اور براڈوے کے ہنٹر بیف کا اہتمام کیا جائے کہ اب یہی کاروائی ہمارے بس میں تھی۔ بعد میں چھٹّی ہونے پر جب کمانڈر انچیف کے دفتر کے سامنے سے گزرے تو دفتر کی منڈیر پر ہماری بریگیڈ ئیری بلبل بن کر گا رہی تھی۔

میں عندلیبِ گلشن نا آفریدہ ہوں

## رانجھے نوں سمجھاون آئیاں بھیناں تے بھرجائیاں

اور ہم عندلیب کو آنکھ مارتے آگے گزر گئے مگر دوستوں کو ایسا موقع خدا دے۔ پہلے ہمیں پیش از وقت ترقّی دے کر تہنیت کے ترانے شروع کر دیئے تھے۔ اب خود ہی تعزیت کے پیغام لے کر آنے لگے۔

"دِل میلا نہ کیجئے مہریان۔ جنرل یحیٰی ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ کمانڈر انچیف بدلتے رہتے ہیں۔ کسی کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں؟ اسی کرسی پر کوئی رحمدل چیف بھی آجائے گا۔ سو اس دن کا انتظار کرو مگر فی الحال، یار مظلوم رکھ تسلّی کہ یوں مقدر تھا! ہمیں بریگیڈیئر نہ ہونے کا تو ایسا غم نہ تھا لیکن ان غم گساروں نے وہ حال کر دیا کہ

کوئی دیکھے تو جانے مار ڈالا"

غم خواروں کی ایک دوسری ٹولی ایک اور مرہم لے کر آ گئی۔

"اجی غم نہ کریں بریگیڈئیری نہ ملنے کا۔ بھلا یہ بھی کوئی عہدہ ہے؟ انسان کرنل ہو یا جرنیل جیسا کہ ملکہ ترنّم نے بصد حسرت کہا ہے 'ہائے نی کرنیل نی، جرنیل نی'۔ کیا یہ کم خوش بختی ہے کہ تم ایک ملکہ کی نگاہ میں ہو؟ اور سچ پوچھو تو ان عہدوں میں رکھا ہی کیا ہے؟ ریٹائر ہوتے ہی ساری پھونک نکل جاتی ہے۔ مگر ایک ادیب یا شاعر مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ غالب نے لاکھ کہا: سو پشت سے ہے پیشہ سپہ گری مگر آنجناب شہرت کے آسمان پر خورشید و ماہ بن کر چمکے تو اس لئے نہیں کہ ایک بریگیڈئیر [42] کے نواسے تھے بلکہ اس لئے کہ خود شاعر تھے۔ نہیں صاحب، جو شان شاعر یا ادیب کی ہے وہ کسی سہ یا صد ہزاری کی بھی نہیں ہو سکتی۔ بجنگ آمد جیسی کتاب کا مصنّف ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ ماشاء اللہ کل چھپی ہے اور آج ساری پنڈی میں، بلکہ گوجر خاں تک چرچا ہے۔ کل اسے آدم جی ادبی انعام ملے گا تو سارے پاکستان میں دھوم مچ جائے گی اور تمہارا نام بچّے بچّے کی زبان پر ہو گا اور اگر یہ بچّے بڑے ہو گئے، جیسا کہ شفیق الرحمان کی دریافت کے مطابق یہ ہو جاتے ہیں، تو ان کے بچّوں کی زبان پر ہو گا۔ اب بریگیڈئیر کا تو ذکر ہی چھوڑو کیا کسی فیلڈ مارشل نے بھی اس سرعت سے شہرت پائی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے اتفاقاً مارشل لا [43] بھی لگایا ہو؟

---

[42] غالب کے نانا سہ ہزاری تھے یعنی تین ہزار سپاہیوں کے کمانڈر۔ یہ عہدہ آج کل بریگیڈیر کے برابر سمجھنا چاہیے۔

[43] اشارہ تھا فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی طرف جو مارشل لاء کے بعد حکومت قائم کر کے ان دنوں بڑے مشہور و مقبول ہو گئے تھے۔

# محمد خان سے خود پوچھو بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن دوستوں کی تقریروں اور تمسخر کے باوجود اگر ہمیں بریگیڈیئری مل جاتی تو ہم بڑے شوق سے اسے سینے سے لگاتے اور وہ تین پھولوں کی مثلث کندھوں پر سجاتے، مگر وہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھی اور شکر ہے کچھ روز کِھل کر نہیں مرجھائی تھی، ورنہ جب کبھی وہ پھول یاد آتے دِل پر قیامت گزر جاتی۔ چنانچہ بریگیڈیئری کے پھول ہمارے ذہن سے محو ہونے لگے اور اب ہمارے سامنے آدم جی ادبی انعام کا غنچۂ ناشگفتہ لہرانے لگا جس کے کھِلنے کی امید میں ہم غنچے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے اور یہ امید ایسی بے جا بھی نہ تھی۔ ان دنوں کئی نامور ادیبوں اور نقادوں نے بجنگ آمد کی تعریفوں کے اس فیاضی اور فضول خرچی سے پُل باندھے تھے اور ہماری خودی کو اس قدر بلند کر ڈالا تھا گویا جج صاحبان ہم سے خود پوچھنے آئیں گئے۔ ''محمد خان، بتا تیری رضا کیا ہے؟'' ادھر ہماری فین میل تو گویا مبارک بادوں کی لین ڈوری تھی، چنانچہ دوست خطوط، اخبار اور رسالے ہاتھ میں اُٹھا کر باآوازِ بلند کہنے لگے۔ اب ہے کسی کی مجال جو آدم جی انعام ہمارے یار کے قدموں میں نہ ڈال دے بلکہ خود سیٹھ آدم جی بھی چاہتے تو نہیں روک سکتا۔

دوستوں کی تعریفوں میں بے شک دوست پروری بلکہ دھاندلی کا بھی عنصر تھا تاہم زبانِ خلق کا فیصلہ بظاہر بجنگ آمد کے حق میں تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہمیں زبانِ خلق سے اختلاف نہ تھا؟

آخر وہ دن آیا جب آدم جی ایوارڈ کا اعلان ہونا تھا اور اعلان ہوا۔

"اس سال اُردُو ادب کی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جو آدم جی ادبی انعام کے قابل ہو لٰہذا انعام روک لیا گیا ہے اور اسے اگلے سال کے انعام میں ضم کر دیا گیا ہے۔ اعلان ختم ہوا!"

سچی بات ہے ہمیں اس غیر متوقع فیصلے پر کسی قدر مایوسی ہوئی اور تھوڑی دیر کے لئے تنہائی میں منہ بھی لٹکایا، لیکن پھر فوجی روایات کے مطابق جلد ہی منہ کو سنبھالا اور ایک GOOD LOSER (اچھے ہارنے والے) کی طرح نہ صرف ججوں کے فیصلے کے احترام میں سر خم کیا بلکہ خندہ پیشانی سے ہر جج سے فرضی ہاتھ بھی ملائے اور دِل کو سمجھایا کہ شاید تم ہی میں تھی نہ کوئی بات!۔۔۔ مجھے ان مصنّفین کی یہ ادا پسند نہیں آئی جنھوں نے انعام نہ ملنے پر اپنی اگلی کتاب کے پہلے صفحے پر لکھا دیا ہے۔ "یہ کتاب ادبی انعام کے لئے پیش نہیں کی جائے گی۔" یہ سادہ سا جملہ جو بظاہر مصنّف کی انعام سے بیزاری کا اعلان ہے، حقیقت میں انتہائی غصّے کی علامت ہے اور انعام کے لئے شدید

خواہش کا غماز ہے۔۔۔ ویسے انعام کی خواہش یا توقع رکھنے میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ سراسر جائز جذبہ ہے مگر انعام نہ ملنے پر غضبناکی یکسر ناروا ہے۔

## ہیں کواکب کچھ۔۔۔

کئی روز بعد، جب انعام کا قصّہ تقریباً بھول چکے تھے، لاہور میں دوستوں کی مجلس میں بیٹھے تھے کہ آدم جی ایوارڈ کا ذکر چھڑ گیا۔ اس مجلس میں ایوارڈ کمیٹی کے ایک جج بھی تشریف فرما تھے۔ ایک بے باک اور طرفدار سے دوست نے جج صاحب سے سوال کر دیا کہ "صاحب اس سال اُردُو نثر کی کسی کتاب کو انعام کے قابل نہ سمجھا گیا حالانکہ بجنگ آمد جیسی مقبول کتاب بھی شریکِ مقابلہ تھی۔ یہ کیا گھپلا ہوا؟" جج صاحب نے نہایت ایمانداری سے اس میٹنگ کی روداد بیان کر دی جس میں یہ فیصلہ ہوا تھا۔ فرمانے لگے۔

"کوئی گھپلا نہیں ہوا۔ ہم پانچ جج تھے۔ میٹنگ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ صرف دو جج کتاب پڑھ کر آئے ہیں۔ ایک میں جو کتاب کے حق میں تھا اور دوسرے پروفیسر "ع" جو کتاب کے مخالف تھے۔ باقی ججوں نے جو سب کے سب اونچے درجے کے شاعر، ادیب یا افسر تھے، ہم دونوں کو اپنے اپنے دلائل پیش کرنے کو کہا۔ میں نے حتیٰ المقدور بجنگ آمد کے فضائل بیان کئے اور ازراہ اپیل، یہاں تک کہہ دیا کہ مصنّف ایک پس ماندہ بلکہ

ان پڑھ قبیلے کا فرد ہے۔ پیشے کے لحاظ سے سپاہی ہے لہٰذا اس اعتبار سے خصوصی رعایت کا مستحق ہے لیکن پروفیسر "ع" نے جو اہلِ زبان بھی تھے اور اہلِ علم بھی جواب میں فرمایا کہ مصنّف کے ذاتی اور قبائلی کوائف ہر چند کہ دلگداز ہیں۔ تاہم آدم جی ادبی ایوارڈز کوۃ نہیں بلکہ انعام ہے جو مصنّف کی بے کسی ناپ کر نہیں، بلکہ کتاب کی دلکشی جانچ کر دینا چاہیے اور دلکشی اس کتاب میں ناپید ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کتاب مصنّف سے بھی زیادہ بے کس نظر آتی ہے۔ اس تقریر پر باقی جج صاحبان ایک خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ چونکے۔ لگے ہاتھوں پروفیسر "ع" نے کتاب کی زبان و بیان کی کوتاہیوں پر روشنی ڈالنا شروع کی۔ روشنی اس قدر تیز اور عالمانہ تھی کہ جج صاحبان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر کے پروفیسر صاحب کی تائید میں ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں نے اپنا ووٹ تو کتاب کے حق ہی میں دیا مگر کچھ بات ہے پروفیسر "ع" کی تقریر کے بعد مجھے بھی کتاب کچھ بوگس لگنے لگی۔"

میں نے یہ کہانی سُنی تو اطمینان ہوا کہ بے شک کوئی گھپلا نہیں ہوا، لیکن ابھی سال بھی نہ گزرا تھا کہ ایک واقعہ پیش آیا جو اس مسئلے پر ذرا مختلف قسم کی روشنی ڈالتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک روز اچانک میرے نام پروفیسر "ع" صاحب کا محبّت نامہ وارد ہوا جس کا مضمون خود ان کے الفاظ میں یہ تھا۔

محب مکرم۔ سلام مسنون۔

میں میٹرک کے طلبہ کیلئے اُردُو کا نصاب مرتّب کر رہا ہوں۔ اس میں بجنگ آمد کا ایک ٹکڑا شامل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ نے اجازت مرحمت فرمادی تو ان دعاؤں میں جو آپ کی تحریریں پڑھتے وقت بارہا دِل سے نکلی ہیں، ایک دعا اور شامل ہو جائے گی۔ امید ہے جواب باصواب جلد عنایت ہو گا۔ والسلام

خیر طلب

"ع"

## یوسفی کا کاٹا

یہ خط میرے لئے آدم جی ایوارڈ سے بہتر انعام تھا۔ بیشک اس سے پہلے پروفیسر "ع" صاحب نے ایک پتھر دے مارا تھا لیکن اب ایک پھول پھینک کر تلافی بھی کر دی تھی۔ چنانچہ عرصہ تک میں اس قدر دانی پر چپکے چپکے اِتراتا رہا تا آنکہ چند سال بعد مشتاق احمد یوسفی کی زرگزشت سامنے آئی۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے تعریف تو اس بے مثل مزاح نگار ابن انشا کی کی اور بجا طور پر کی، لیکن تان ایک عجیب بات پر جا توڑی۔ ذرا یوسفی صاحب کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

”ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار ابن انشا کے بارے میں کہیں عرض کر چکا ہوں کہ بچھّو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ انشا جی کا کاٹا سوتے میں مسکراتا ہے۔ جس شگفتہ نگار کی تحریر اس معیار پر پوری نہ اُترے، اسے یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دینا چاہیے۔“(زرگزشت صفحہ ۱۳)

ملاحظہ فرمایا آپ نے یوسفی کا آخری جملہ؟ گویا جس اعزاز پر ہم اترا رہے تھے، وہی ہمارے پھسڈی ہونے کا ثبوت تھا۔ مگر کیا سچ مچ پروفیسر ”ع“ نے ہمارا مضمون شاملِ نصاب کرنے سے پہلے کسی کو پڑھا(کٹوا) کر بستر پر لٹا دیا تھا اور دورانِ خواب اس کے لبوں کو مسکراہٹ سے پاک پا کر ہی مضمون قبول کیا تھا؟ مگر نصاب میں فقط ہمارا مضمون ہی تو نہ تھا۔ اس میں تو غالب سے لے کر آزاد، شبلی، حسرت اور پطرس سے ہوتے ہوئے احمد ندیم قاسمی تک سب لوگ شامل تھے۔ کیا یہ مشاہیر ادب بھی ”سونے مسکرانے“ کے ٹیسٹ میں فیل ہو گئے تھے؟ ناممکن! یہ ٹیسٹ کی ہوائی یوسفی نے یقیناً تفریحاً اُڑائی تھی ورنہ خود انشا جی کی تحریریں شاملِ نصاب نہ ہوتیں اور ممکن ہے اگلے سال یوسفی بھی مرتبینِ نصاب کی زد میں آ جائیں۔ بلکہ حیرت ہے کہ وہ آج تک بچے کیسے رہے۔ بہر حال وہ جب تک زیرِ دام نہیں آتے، ہمیں اُن کے طنزیہ کنکر خندہ پیشانی سے برداشت کرنے پڑیں گے، کیونکہ ان کا کاٹا بھی سوتے، جاگتے اور اونگھتے مسکراتا ہے۔

# اوئی! کتّی بڑی سرپرائز ہو گی ممی کیلئے

ایک خوشنما کنکری ایک دن لاہور میں نازل ہوئی۔ مجلس میں دوستوں کے علاوہ کالجوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکیوں میں ایک الھڑ سی ماڈرن سی شے تھی جو زبان کی گرم تھی، لیکن قابلیت کی معتدل۔ ہمیں گوشت پوست میں دیکھ کر ایک حیرت کے عالم میں کہنے لگی۔

ہائے اللہ، آپ زندہ ہیں؟ میں تو سمجھی تھی کہ آپ پچھلی صدی میں گزرے ہیں۔ پلیز میری بُک میں آٹوگراف دے دیجئے اور آج کی تاریخ بھی لکھ دیں اور پلیز ہمارے گھر آئیں ناں۔ میں آپ کو اپنی ممی سے ملانا چاہتی ہوں۔ اوئی! کتّی بڑی سرپرائز ہو گی ممی کیلئے!"

اگر ہم سچ مچ اپنی دعوت دہندہ کے ساتھ چل پڑتے تو اس کی زندہ ممی کیلئے کچھ اسی قسم کی سرپرائز کا باعث بنتے جیسے مصر کی کوئی مردہ ممی ان کے ہاں دستک آ دیتی، چنانچہ آٹو گراف بُک میں تو میں نے بخوشی اپنا نام لکھ دیا مگر ان کی ممی کے حضور جانے سے پرہیز کیا کہ کہیں محترمہ مجھے میرا بھوت سمجھ کر غش میں نہ ڈوب جائیں اور ہماری الھڑ میزبانہ کو ڈاکٹر یا پولیس یا دونوں نہ بُلانے پڑیں۔

# دفتر سے بستر تک

اگلا پتھر۔۔۔ لیکن ہلکا پھلکا، دلچسپ اور خوبصورت۔۔۔ کراچی سے آیا۔

اس کا نشانہ براہ راست ہم نہ تھے، ہماری بجنگ آمد تھی یعنی بجنگ آمد کا چال چلن اور اس کا پہناوا۔ پتھر ایک ملفوف کی شکل میں تھا۔ کھولا تو اندر سے دو خط نکلے۔ پہلا تھا جناب واصل عثمانی کا بنام مصنّف۔

"محترم کرنل صاحب۔ میرے ایک دوست جناب رشید الدین مجھ سے بجنگ آمد عاریتاً پڑھنے کی غرض سے لے گئے۔ انہوں نے اس کا گرد پوش اُتار کر علیٰحدہ رکھ دیا، اور کتاب پڑھنا شروع کی مگر کوئی دوسرے صاحبِ ذوق کتاب ٹیپ لے گئے۔ اس حسرت ناک واقعہ پر رشید صاحب نے مجھے خط لکھا جو آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس خط میں رشید صاحب کے قلم نے جو گُل کھلائے ہیں۔ امید ہے انہیں پڑھ کر آپ محظوظ ہوں گے۔

دعا گو واصل عثمانی"

اور قارئین یہ ہیں رشید الدین صاحب کے کھلائے ہوئے پھول جن سے میں تنہا محظوظ نہیں ہونا چاہتا۔ سو ملاحظہ ہو خط از جناب رشید الدین بنام واصل عثمانی صاحب۔

”مشفقم واصل صاحب۔ آپ سے بجنگ آمد مستعار لایا تھا۔ کرنل محمد خاں نے جنگِ عظیم سے اب تک اس کو پروان چڑھایا، بنایا، سنوارا اور دوست احباب کے اصرار پر مجبوراً بازار میں لا بٹھایا۔ منظرِ عام پر اس کی شوخی رنگ لائی۔ اپنی سج دھج اور شیریں زبانی سے لوگوں کا دِل گرمایا۔ بہت سے شیدائی پیدا کئے۔ چند روپوں کے عوض جس نے چاہا اس کی قربت حاصل کی۔ اس بازار کے تجزیہ کار اور کہنہ مشق حضرات (جن میں آپ بھی شامل ہیں) بھلا کب چوکتے۔ خود لطف اندوز ہوئے، دوست احباب کی تفریح کا بندوبست کیا۔ آپ کی عنایت بے تکلّفانہ سے مجھے بھی اس کی صحبتِ لطیف کا شرف رہا۔ دفتر سے بستر تک وہ میرے ساتھ رہی۔ اپنے حُسنِ پوشیدہ کو جھجھک جھجھک کر عیاں کرتی رہی؟ مگر صد افسوس، وہ بے وفا نکلی۔ وفا کی تو پہلے ہی امید نہ تھی۔ بازار سے جو آئی تھی۔ چلی گئی۔ کسی کے ساتھ اور کہاں؟ کچھ معلوم نہیں۔ فی الحال اس کی ازار بطور یادگار حاضر ہے۔ قبول فرمائیں اور بجنگ آمد نہ ہوں۔

آپ کا رشید“

ہر چند کے رشید صاحب نے جانے والی کے چال چلن کے متعلق چند نازیبا الفاظ استعال کئے تھے تاہم ایک بات واضح تھی اور وہ یہ کہ انہیں اس سے بے پناہ محبّت تھی۔ کوئی عاشق بشمول مجنوں و رانجھا آج تک اپنی محبوبہ کو دفتر میں بھی نہیں لے گیا۔ ان حالات میں میں نے مناسب سمجھا کہ رشید الدین صاحب کو ایک جلد بجنگ آمد کی بوساطت

جناب واصل عثمانی بھیجی جائے۔ اتفاق سے اس جلد پر گرد پیش نہ تھا۔ ملاحظہ ہو فارورڈنگ لیٹر از مصنّف بنام واصل عثمانی صاحب۔

"جناب واصل صاحب۔ صد افسوس کہ وہ رشید صاحب کو دغا دے کر کسی نامحرم کے ساتھ چل دی۔ بے شک رشید صاحب نے اسے بستر سے دفتر تک سینے سے لگائے رکھا، تاہم معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب کا اندازِ محبّت اس کیلئے وجہ تسلّی نہ ہو سکا ورنہ وہ یوں بے ازار گھر سے نہ بھاگ نکلتی۔

بہر حال اب مغویہ کی بازیابی تو مشکل نظر آتی ہے، لیکن خوش قسمتی سے اس کی ایک ہمجولی میرے پاس رہتی ہے جو اتفاق سے بچپن سے ہی بے ازار ہے۔ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں اور کسی غیر نے تو اسے چھُوا تک نہیں چنانچہ اس توقع پر کہ شاید جانے والی کی ازار اسے فٹ آجائے، آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اس کی ستر پوشی ہو جائے گی اور شاید آپ کے دوست رشید صاحب کا گھر پھر سے آباد ہو جائے گا۔

خیر اندیش مصنّف"

# سنگ آمد و سخت آمد

ایک نہایت ہی حسین مگر وزنی پتھر محترمہ میم الف نے دے مارا۔ آپ ان دنوں ایک میڈیکل کالج کی طالبہ تھیں۔ آپ نے ایک شاہانہ ”ہم“ اور زنانہ شہنشاہیت کے ساتھ خط کا آغاز کیا۔

مصنّف صاحب۔ السلام علیکم۔

آپ ہم کو نہیں جانتے اور ہم بھی آپ سے واقف نہ ہوتے اگر بجنگ آمد ہمارے مطالعہ میں نہ آجاتی۔ اب ممکن ہے آپ خیال کر رہے ہوں کہ ہم آپ کی تعریف کا ارادہ رکھتے ہیں یا یہ کہنے کا کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ نہیں جناب، ہم کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ ایک کھردرے فوجی کے قلم کی اتنی ہی ”گل افشانی“ بات ہے۔ اس سے زیادہ کی نہ تاب ہے، نہ مجال نہ طاقت۔

اب سنئے اپنی کتاب کے بارے میں ہمارے سات اعتراض۔

۱۔ اس مقدمہ میں صفحہ ۱۴ پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ”ہم نے دیکھا کہ ہمارے ایک دوست بجنگ آمد کا ایک باب ہلال میں پڑھتے ہوئے ایک دو مرتبہ مسکرا دیئے۔ اس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور

وہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گزرے، تو علمِ ریاضی کی رو سے لازم آتا ہے کہ ملک میں مسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہو گا۔۔۔"

گویا آپ کو سچ مچ مغالطہ ہے کہ آپ کی کتاب پڑھنے سے مسکراہٹوں کا تناسب بڑھے گا۔ نہیں صاحب ایسا کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ آپ اپنی غلط فہمی جھاڑ دیں۔ اگر تھوڑی سے ہنسی ہمیں آئی بھی تو وہ ہماری ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا نہ کہ آپ کی کتاب۔

۲۔ چند ابواب۔۔۔ عشقِ لفٹینی، سیالکوٹ میں ایک سال، ویکائی سکول۔۔۔ قابلِ برداشت ہیں۔ باقی بابوں میں تو سیدھی سادی جنگِ عظیم کی تاریخ ہے جو کسی بھی تاریخ کی کتاب میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کیلئے بجنگ آمد کا مطالعہ ضروری نہیں، بلکہ اسے پڑھنا تو آپ پر رحم کرنا ہے جس کے آپ مستحق نہیں۔

۳۔ صفحہ ۱۶ پر آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"قاری عالی مقام۔ اگر آپ کو یہ کتاب پسند آگئی تو ظاہر ہے کہ آپ معقول آدمی ہیں۔۔۔"

گویا پسند نہ آئی تو نا معقول! (آپ نے لفظ نا معقول لکھا تو نہیں، لیکن آپ کے ذہن میں ضرور تھا۔ کیوں ہم ٹھیک کہتے ہیں ناں؟) واہ۔ اچھی زبردستی ہے۔ ایک تو کتاب پڑھو اور اوپر سے پسند بھی کرو ورنہ شاید آپ کورٹ مارشل ہی کر دیں گے۔

۴۔ صفحہ ۱۹ پر مقدمہ ثانی میں آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کسی کتاب کی مقبولیت لازماً اس کی معقولیت کی سند نہیں مگر جہاں تک آپ کو قبولِ عام کا مغالطہ ہے تو صاحب اس پر بھی غور فرمائیے کہ شمع، دھنک، مصوّر اور اس قسم کے دوسرے رسالے بجنگ آمد سے کہیں زیادہ مقبول ہیں مگر نئی نسل میں GASTRO INTESTINAL DISTURBANCES ہی پیدا کر رہے ہیں۔ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ بولیں۔

۵۔ آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد ہم کو بہت سی فوجی عادات کا اندازہ ہوا۔ پہلی عادت تو یہ ہے کہ آپ فوجی حضرات نہایت دِل پھینک ہوتے ہیں اور یہ بے حد عجیب بات ہے کہ اس قدر سخت اور کھردرا شخص دِل پھینک بھی ہو۔

٦۔ سب سے تکلیف دہ حقیقت جس کا انکشاف ہوا، یہ ہے کہ فوری حضرات DRINK کرتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔ ہم تو اقبال کے اس خیال سے متفق ہیں کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

۷۔ اور آخر میں ہمیں یقین ہے کہ آپ ہماری COMMENTS کا بُرا مانیں گے، حالانکہ آپ کو چاہیئے کہ اپنی اصلاح کریں اور ہماری شکایات (جو بجنگ آمد کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں) رفع کریں۔

والسلام۔ میم۔ الف

آج تک ہم چھوٹی موٹی تعریفوں کے عادی تھے اور سچ پوچھیں تو ان روٹین تعریفوں اور شاباشوں سے کچھ بور ہونے لگے تھے، چنانچہ محترمہ م۔ الف کے سنگِ ہفت رنگ سے ہمیں درد کے ساتھ درماں کا احساس بھی ہوا اور ہم نے خون دو عالم اپنی گردن پر لیتے ہوئے جواباً لکھا۔

محترمہ۔ آپ کا خط پڑھ کر ایک عجیب مسرّت ہوئی کہ آخر بجنگ آمد کا کوئی قاری یا قاریہ تو ہماری ہم خیال نکلی۔ ہمیں شروع ہی سے احساس تھا کہ کتاب بوگس ہے، بلکہ مقدمے کی پہلی سطر میں ہی اعتراف کر لیا تھا کہ یہ کوئی انقلاب اور کتاب نہیں۔ خدا جانے کیوں کچھ نیم حکیم قسم کے لوگوں نے اسے آسمان پر چڑھا دیا۔ ان ناموافق حالات میں آپ کی ماہرانہ بلکہ حکیمانہ رہنمائی کیلئے شکر گزار ہوں۔ اور جیسا کہ آپ

ذیل کی سطور میں دیکھیں گی سوائے ایک آدھ کے آپ کے ساتوں ارشادات یا الزامات کا مجھے پورا اقرار ہے۔

۱۔ آپ کا یہ اشارہ کہ کتاب چھپنے سے مسکراہٹوں کا تناسب نہیں بڑھا، سراسر درست ہے۔ بلکہ سمجھدار لڑکیوں کو تو ہنسنے کی بجائے رونا آتا ہے۔ چنانچہ سُنا ہے اب اس کتاب کا بہترین مصرف یہ ہے کہ نئی دلہنوں کو رخصتی سے ذرا پہلے پڑھا دی جائے کہ ڈولی میں بیٹھتے وقت آسانی اور روانی سے رُو سکیں اور ہیر کو شرما سکیں جس کے متعلق وارث شاہ کا بیان ہے کہ ''ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں، مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے'' مگر کیسے نہ چیختی؟ اس نے بھی خفیہ خفیہ بجنگ آمد پڑھ لی ہو گی۔ اور ہاں ایک استفسار۔ یہ ذاتی کوشش سے کیسے مسکرایا جاتا ہے؟

۲۔ آپ کا یہ فرمانا کہ چند ابواب کے علاوہ باقی ساری کتاب میں جنگ عظیم کی تاریخ دہرائی گئی ہے بالکل بجا ہے، میں تو سمجھا تھا کہ تاریخ کی وہ کتاب جس سے میں نے نقل ماری ہے، کسی کے ہاتھ نہ لگے گی، لیکن مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ کھوج لگانے والے کہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب ایک احسان کریں۔ اس راز کو اپنے تک ہی رکھیں، ہمارا پول زیادہ نہ کھولیں۔ نہیں کھولیں گی ناں؟

۳۔ نہیں محترمہ، ہماری کیا مجال جو کسی کو اور خصوصاً آپ کو نامعقول سمجھیں، بلکہ گستاخی معاف؟ آپ نے تو یہ لفظ زبردستی میرے منہ میں رکھ دیا اور پھر گلے پر چھُری رکھ کر پوچھتی ہیں۔ ''کیوں ہم ٹھیک کہتے ہیں ناں؟'' اب اگر نفی میں جواب دوں تو آپ کو جھٹلانے کی خطا سرزد ہو گی۔ اور ہاں کہہ دی تو پھر آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کا کورٹ مارشل کرنا پڑے گا۔ اب آپ ہی ہمارے لئے ہاں اور نہ سے ایک چُن کر ہمیں اذن تعمیل دیں۔

۴۔ قبولِ عام کے ضمن میں آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے کہ شمع، دھنک اور بجنگ آمد میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کیلئے بجنگ آمد GASTRO INTESTINAL DISTURBANCES کا باعث بنی۔ بہر حال خدا کا شکر ہے آپ تو ڈاکٹر یا فی الحال نیم ڈاکٹر ہیں کچھ علاج کر لیں گی۔ ترس تو بجنگ آمد کے ان قارئین پر آتا ہے جو کسی میڈیکل کالج کے طالب علم نہیں۔ کچھ علاج ان کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟

۵۔ جی ہاں، فوجی دِل پھینک تو ہوتے ہیں، مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ وہ تو جان پھینک بھی ہوتے ہیں۔ وہ محبوب کیلئے دِل پھینکتے ہیں اور وطن کیلئے جان۔ وہ شخص کس کام کا جو اپنے دِل و جان سے چمٹا رہے؟ پھر خدا جانے، آپ فوجیوں کو اتنا کھردرا کیوں سمجھتی ہیں؟ وہ دشمنوں کیلئے بے شک کھردرے ہوتے ہیں،

لیکن دوستوں کیلئے تو خالص ریشم بن جاتے ہیں۔ آپ اقبال کے جس شعر سے متفق ہیں۔ خود ستائی معاف، وہ ہماری ہی تعریف میں لکھا گیا ہے۔

۶۔ جی ہاں، فوجی حضرات پی بھی لیتے ہیں، مگر عام طور پر نہیں، بس خال خال۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی غیر فوجی پی لیتے ہیں۔ ویسے مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ ان خال خال کو بھی خالص پانی پینا چاہئے یا خالص دودھ لیکن ایک تو یہ دونوں کمیاب ہیں۔ دوسرے کسی اکے دُکے دِل جلے کی پیاس اگر سگرٹ ایمونیا ایرومیٹ کی بجائے ذرا زیادہ تند مشروب ہی سے بُجھ سکے تو بجھا لینے دے غریب کو۔ دعا دے گا۔ چنانچہ استدعا ہے کہ بیشتر فوجی اس خاکسار سمیت جاں بخشی کے مستحق ہیں۔ براہ کرم ان کی سزا پر نظر ثانی فرمائیں۔

۷۔ آپ کی باتیں اور برا مناؤں؟ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔ آپ کے ارشادات سر آنکھوں پر۔ اب صرف اتنا فرمائیں کہ کیا آپ کی شکایات رفع ہو گئیں؟ کیا ہماری خطائیں معاف کر دیں؟

مخلص مصنّف

تو کیا محترمہ نے ہمیں سچ مچ معاف کر دیا؟ نہیں جناب، ہمارے خط کا جواب ہی نہ دیا جس سے ظاہر ہے کہ خون دو عالم گردن پر لینے کے باوجود محترمہ کا دِل نہ پسیجا۔ حالانکہ

انہوں نے میٹرک میں اعلیٰ فرسٹ ڈویژن لینے پر یقیناً اخباری بیان دیا ہو گا کہ ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرونگی۔۔۔ بعض ڈاکٹر یعنی لیڈی ڈاکٹر بھی بڑی سنگدل ہوتی ہیں!۔۔ چنانچہ اس سنگِ ہفت رنگ کی چوٹ کا ہلکا ہلکا درد اب تک باقی ہے۔

## آیئے ملئے بجنگ آمد کے مصنّف سے

جب میرے دوست، اجنبی حضرات سے میرا تعارف بطور مصنّف بجنگ آمد کراتے ہیں تو بالعموم مجھے تین قسم کے لوگوں سے رابطہ پڑتا ہے۔ ایک وہ جو یہ کتاب پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے پڑھی تو نہیں مگر اس کے متعلق کچھ سن رکھا ہے۔ تیسرے جنہوں نے دیکھی ہے نہ سنی بلکہ اپنی چیک بُک کے سوا کسی بُک سے آشنائی نہیں۔

پہلی قسم کے کرم فرماؤں سے کوئی تعارف کرائے تو وہ کسی قدر شوق اور شفقت بلکہ بعض اوقات تپاک سے مصافحہ کرتے ہیں اور ملاقات ہو جانے پر اظہارِ مسرت فرماتے ہیں، مگر دوسری قسم سے تعارف کرانے پر انہیں ہمارا نام یوں لگتا ہے جیسے کبھی خواب میں سنا ہو، مگر مروّت میں آکر اظہارِ مسرت کا بھی تھوڑا سا انتظام کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"اچھا تو آپ ہیں جنھوں نے "تنگ آمد بجنگ آمد" لکھی ہے۔ ماشاء اللہ کیا عمدہ کتاب ہے۔"

مجھے بارہ سالوں کے تجربے سے یقین ہو گیا ہے کہ جب بھی کوئی مہربان اجنبی کتاب کے نام پر پورا محاورہ۔۔۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔۔۔ صرف کر دیتے ہیں تو انہوں نے کتاب کے متعلق کچھ سنا ضرور ہوتا ہے، لیکن پڑھی نہیں ہوتی۔ فقط ایک ملائم سا دروغ مصلحت آمیز بول کر میرا دِل رکھتے ہیں۔ گو دِل رکھنا بھی اتنی بڑی نیکی ہے کہ بریں نیکی گر جاں فشانم رواست۔ چنانچہ حتیٰ المقدور جانفشانی کرتا ہوں لیکن کچھ زیرِ لب ہنسی بھی آتی ہے کہ موصوف مروّت کا کتنا بھاری بوجھ جھوٹ کے بل پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

## ایک جملہ معترضہ ربڑ کی ناک والا

مصلحت آمیز جھوٹ کی بات چلی تو ہمیں ایک پرانے اور دلچسپ رفیقِ کار میجر "ج" یاد آ گئے جنہیں دروغ گوئی۔۔۔ اور وہ بھی یکسر بے مصلحت!۔۔۔ ہمیں بے پناہ ملکہ حاصل تھا۔ آپ کو جھوٹ کی ضرورت اکثر بڑ مارنے کے سلسلے میں پیش آتی تھی اور بڑ وہ ضرور مارتے تھے، خواہ اپنی پرائمری تعلیم کا ہی ذکر ہو، چنانچہ ایک دفعہ تعلیمی بڑ مارتے ہوئے فرمانے لگے۔

"جب میں ڈیرہ دون میں کرنل براؤن کے کیمرج سکول میں زیرِ تعلیم تھا تو۔۔۔"

پیشتر اس کے کہ میجر صاحب جملہ مکمل فرماتے، ہمارے ایک ستم ظریف دوست نے، کہ شریکِ محفل تھے اور جانتے تھے کہ میجر صاحب کالا شاہ کاکو سے آگے ڈیرہ دون کی سمت میں نہیں بڑھے، میجر "ج" سے پوچھنے لگے۔

"میجر صاحب، قطع کلام معاف۔ آپ کے کرنل براؤن نے ربڑ کی ناک کیوں لگوا رکھی تھی؟"

اب کرنل براؤن کی ناک بالکل اصلی گوشت کی ناک تھی جیسی ہم سب کی ہوتی ہے، لیکن میجر صاحب نے کبھی کرنل براؤن کو دیکھا ہو تو تردید فرماتے، چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے کہ ناک ربڑ ہی کی ہو گی، دھڑلے سے وضاحت فرمائی۔

"اچھا وہ ناک جی ہاں، تو وہ اس لئے لگوائی تھی کہ اصلی ناک پولو کھیلتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی۔۔۔" اور یہ سوچتے ہوئے کہ جھوٹ میں کوئی کسر نہ رہ گئی ہو، مزید فرمایا۔

"میں خود اس پولو میچ میں موجود تھا۔ اچانک گھوڑا بِدک گیا اور کرنل براؤن ناک کے بل وہ جا گرے۔ OH WHAT A PITY!"[44]

[44] کاش ایسا ہوتا۔

میجر ''ج'' تو جملہ معترضہ کے طور پر داخل داستان ہو گئے۔ بات بجنگ آمد اور تعارف کی ہو رہی تھی۔ بجنگ آمد کے لئے تنگ آمد کی فرضی ناک چند بامروّت میجر جیموں کا عطیہ ہے۔

لیکن سب سے دلچسپ تیسری قسم ہے جن سے میرے خوش فہم دوست کچھ اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

''آیئے شیخ صاحب، ملئے ان سے۔ یہ کرنل محمد خاں ہیں، وہی بجنگ آمد والے۔''

اور یہ کہنے کے بعد ہمارے خوش فہم طرفدار توقع رکھتے ہیں کہ شیخ صاحب ایک اچنبھے کے عالم میں ہمارا منہ دیکھنے لگیں گے اور پھر یہ کہتے ہوئے ہمارے گلے لگ جائیں گے کہ ''اللہ کیا حسنِ اتفاق ہے جس شخص کے قصّے سُنتے تھے، سچ مچ میرے روبرو کھڑا ہے۔''

مگر ہوتا یہ ہے کہ شیخ صاحب جو بنولے کا تھوک بیوپار کرتے ہیں، مجھے اور میری کتاب کو اپنی توجہ سے یکسر تفریق کرتے ہوئے ہمارے تعارف کنندہ سے کلام جاری رکھتے ہیں۔

''تو سناؤ، بھائی، کھَلی کیسے جا رہی ہے؟ بنولے میں تو سخت مندا ہے۔'' میرے خوش فہم دوست جو سوداگر ہونے کے علاوہ ادب سے بھی مس رکھتے ہیں، میری ناقدری یا اپنے

تعارف کے اکارت جانے پر بے چین ہونے لگتے ہیں۔ مگر شک کا فائدہ شیخ جی کو دیتے ہوئے دوبارہ کہتے ہیں۔

"بنولا جائے بھاڑ میں بھائی، میں تمہیں بتا رہا تھا کہ یہ ہیں کرنل۔۔"

"گولی مارو کرنل کو یار۔ ہمارا تو بھٹھہ ہی بیٹھ گیا ہے۔"

میرے طرفدار اس پر لمبا سانس لیتے ہیں اور تعارف کی کوشش کو ناتمام چھوڑتے ہوئے بنولے کے ڈھیر میں غرق ہو جاتے ہیں۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا

اور ان سب میں بڑا دکھ ہے بنولہ، یارو

خیر، یہ خاکسار تو کس باغ کی مولی ہے۔ سنا ہے کچھ اس سے بھی زیادہ عزت افزا قسم کے تعارف سے ہمارے زعمائے ادب وقتاً فوقتاً دوچار ہو چکے ہیں۔ جناب حفیظ جالندھری کا ایک واقعہ سیّد ضمیر جعفری نے سنایا۔ انہی کی زبانی سنئے۔

۱۹۶۲ء میں سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں حفیظ صاحب کو مقام الف سے ب تک جانا تھا۔ میں ہمرکاب تھا۔ سواری کے لئے تانگا روکا گیا۔ تانگے میں بیٹھ گئے، مگر چلنے سے پہلے حفیظ صاحب نے کرایہ طے کرنا چاہا۔ پتہ چلا کہ آجر اور مزدور کی توقعات کے

درمیان پورے دو روپے کی خلیج حائل ہے جسے پاٹنے کے لئے "کچھ لو اور کچھ دو" کا سنہری اصول برتنے کی ضرورت ہے۔ مگر حفیظ صاحب کا ایک اپنا اور زیادہ سنہری اصول تھا کہ انعام لاکھوں کا دے دو مگر کرایہ وہی دو جو میلوں کے حساب سے بنتا ہے۔ ادھر کوچوان کہ ذرا نک چڑھا سا پوٹھواری راجہ تھا، اَڑ گیا اور دورانِ مکالمہ اس نے اس مقدار سے ذرا کم ادب ملحوظ رکھا جس کے جناب حفیظ مستحق تھے۔ اس خوف سے کہ جناب حفیظ کے مقام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کوچوان کوئی ناقابلِ تلافی بے ادبی نہ کر بیٹھے، میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے حفیظ صاحب کا تعارف کرا دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"میاں کوچوان، یہ فردوسی اسلام، حسان الملک، ابولاثر حضرت حفیظ جالندھری ہیں، ذرا ادب سے بات کرو"۔

کوچوان نے میری طرف دیکھا۔ پھر حفیظ صاحب کو گھورا اور ایک سوالیہ انداز میں بولا: "اچھا؟"

اس سوالیہ "اچھا" کے دو معنی ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ "معاف کرنا مجھے معلوم نہ تھا آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔" یا یہ کہ "یہ منہ اور مسور کی دال۔" میں نے پہلے معنی سمجھے اور حفیظ صاحب کے ہلکے پھلکے پیکر کو مزید وزنی بنانے کے لئے کہا۔

”کوچوان جی۔ جناب حفیظ تو خان بہادر اور ہلالِ امتیاز بھی ہیں۔“ اس پر کوچوان جھٹ بولا: ”تو اترو میرے تانگے سے اترو، جلدی۔۔۔“ اور ساتھ ہی چابک لہراتا ہمیں ایک منٹ میں تانگا خالی کرنے کی دھمکی دیتا، خود ٹانگے سے نیچے کود گیا اور یوں لگا جیسے مہلت کے ایک منٹ کے سیکنڈ بصورت کاؤنٹ ڈاؤن COUNT DOWN گن رہا ہو۔ ساٹھ، انسٹھ، اٹھاون، ستاون. پتہ چلا کہ کمبخت کی ”اچھا: کے معنی مسور کی دال والے تھے۔“

قصہ مختصر، حفیظ صاحب نزاکتِ حالات کو سمجھتے ہوئے ایک سیکنڈ میں۔۔۔یعنی انسٹھ پر ہی۔۔۔ جانِ عزیز کے ساتھ تانگے سے بیل آؤٹ (Bale Out) کر گئے اور میں کہ تن و توش ذرا بھاری رکھتا تھا۔ چار سیکنڈ بعد سلامتی سے ہمکنار ہوا۔ یعنی زمین پر پاؤں رکھا۔ حفیظ صاحب خلافِ توقع کچھ نہ بولے۔ مگر جونہی ٹانگے والا چل نکلا آپ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

”ہور چُوپو[۴۵]۔۔۔“ یہ تھا حفیظ کا حسنِ ظرافت اور اپنے آپ پر ہنسنے کی دلاویز عادت۔

کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مسکرا دیا۔

---

[۴۵] معانی کے لئے براہِ کرم کسی پنجابی سے رجوع کریں۔

حفیظ صاحب کا ذکر تو خیر جملہ معترضہ، بلکہ جملہ مفرح کے طور پر آ گیا۔۔۔ اور زہے قسمت کہ انہیں تحریراً یاد کرنے کا بہانہ[۴۶] مل گیا۔۔۔ ویسے ذکر تعارف پروف لوگوں کا تھا۔ ان لوگوں کی شاعروں اور ادیبوں سے بے خبری اپنی جگہ مگر عام زندگی میں یہ بے خبر بڑے پُر کار اور خبر دار ہوتے ہیں۔ تجارت کریں تو معاملہ خواہ بنولے ہی سے کیوں نہ ہو، کروڑپتی سیٹھ بن کر ہی دم لیتے ہیں۔ اور ملازمت کریں تو نگاہیں سیکرٹری شپ سے دو قدم آگے لگائے رکھتے ہیں۔ اکڑفوں کا مظاہرہ کریں تو تہور علی خان کے سالے دکھائی دیتے ہیں اور انگریز مزاجی کی نمائش مقصود ہو تو لارڈ کرزن کے کزن معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ عظیم الشان بے توفیقے اُرد ُو ادب کے باب میں یکسر یتیم ہوتے ہیں، لہٰذا باقی یتامیٰ کی طرح ہم سب کے پیار اور شفقت کی زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔ اور ان پر برسنے کی بجائے حفیظ صاحب کی طرح ہنس دینا چاہیے۔

## بسلامت روی

بسلامت روی، عمر کے لحاظ سے بجنگ آمد سے کوئی نو سال چھوٹی ہے۔ یہ ۱۹۷۵ء میں پیدا ہوئی۔ بجنگ آمد کے ضمن میں میں نے چند پتھروں کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا

---

[۴۶] مدتیں ہوئی، بجنگ آمد چھپی تو جناب حفیظ جالندھری نے اس قدر پسند فرمائی کہ ایک محفل میں مجھے مبارکباد دیتے ہوئے گلے سے لگالیا اور حسبِ عادت ایک دو جگہ چوما مگر ساتھ ہی گلہ کیا کہ تم نے دوسرے شاعروں کے شعروں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے نام بھی لکھے، مگر میرے اشعار میرا نام لئے بغیر ہضم کر گئے۔ یہ واقعی میری خطا تھی۔ میں نے دلی معذرت کی اور تلافی کا وعدہ کیا۔ میں خوش ہوں کہ ان سطور میں مجھے جزوی تلافی کا موقع مل گیا ہے۔ (مصنّف)

ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجنگ آمد پر پتھروں سے کہیں زیادہ پھول برسے جن کی تفصیل میں نے عمداً نہیں دی کہ ان بے شمار گلبار دوستوں کا حساب میرے دِل ہی میں رہے تو اچھا ہے، مگر بے چاری بسلامت روی پر، گلپاشی کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی حقیقی سنگباری بھی ہوئی۔ گلپاشی کو تو جانے دیں، البتہ چند جھلکیاں اس سنگباری کی ملاحظہ ہوں جو میرے کرم فرماؤں کے خطوط یا پیغامات کی شکل میں نازل ہوئی۔ سنگ تو رنگا رنگ آئے لیکن بنیادی شکایت جملہ سنگ اندازوں کی ایک ہی تھی۔

"سلامت روی میں عورتیں ہیں جو بہت زیادہ بھی ہیں اور بہت خوبصورت بھی۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟"

قارئین گرامی، ایک گزارش۔ مجھے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا ہزار بار اقرار ہے کہ بالکل بے قصور میں بھی نہیں۔ تفصیلی اعترافِ تصور شاید کہیں آگے آئے گا۔ لیکن سرِ دست مجھے ان یارانِ سنگ انداز کی کیوں کیوں کا جواب تو دینے دیں۔ لیکن اپنی صفائی کے دو چار پٹ[۴۷] کھینو مجھے بھی تو لڑھکانے دیں۔۔۔ یار سے چھیڑ چلی جائے اسد!

---

[۴۷] ریشم کا گولہ

# مس سکاٹ پلیز اپنا سینہ توڈھانپ لیں

فرمایایارِخوش آثار صفدر محمود نے۔

"کرنل صاحب آپ کی کتاب میں بے پردہ، پردہ نشینوں کی کثرت ہے۔ چلیں ہم تو انہیں آپ کی خاطر برداشت کرلیتے ہیں مگر ایک عام شریف قاری اسے پڑھ کر بِدک ساجاتاہے۔بے پردہ بیبیوں سے اس قدر تابڑتوڑ میل جول۔ آخر کیوں؟"

عزیز دوست۔ یہ جو آپ نے ہماری جمع کردہ پردہ نشینوں کو ذاتی طور پر بادل ناخواستہ برداشت کرلیاہے اس قربانی کاشکریہ۔رہی آپ کی عام شریف قاری کے لئے دِلسوزی تومیں اس میں برابر کاشریک ہوں۔شریف قارئین کابِدکنا بالکل برحق ہے اورمیں ان تمام خواتین وحضرات سے جوبِدکے ہیں معافی کاخواستگار ہوں۔ خداجانے کتاب لکھتے وقت وہ کون ساموڈ مجھ پر طاری ہوگیاتھاجو میں نے ان پردہ نشینوں کااس قدر ٹھوک جائزہ لیناشروع کردیا۔ عام حالات میں تو آپ خود گواہ ہیں کہ میں مرنجاں مرنج بلکہ خاصا بے زبان قسم کا آدمی ہوں۔ اب سوچتاہوں توفقط ایک بات سمجھ میں آتی ہے جو شاید میری بدپرہیزی کا جواز بھی ہو اور وہ ہے انگستان اور اس کا طریقۂ واردات۔ انگلستان کی زندگی میں عورت۔۔۔ ہمارے مسلم کمرشل بنک کی طرح۔۔۔ خدمت میں اس قدر پیش پیش ہے کہ خدمت گزاروں کی پہلی دو صفوں میں کوئی مرد نظر ہی

نہیں آتا۔ دفتر میں جاؤ تو پہلا مکالمہ عورت سے ہو گا کہ یہ سیکرٹری ہے اور شعلہ روسی ہے۔ دکان میں داخل ہو تو پہلا معاملہ عورت سے ہو گا کہ سیلز گرل ہے اور سمن بوسی ہے۔ بس میں بیٹھو تو پہلا مقابلہ عورت سے ہو گا کہ آپ کی ہم نشین ہے اور تند خو سی ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے دونوں پہلوؤں میں خواتین بیٹھی ہوں یعنی میمنہ اور میسرہ ہر دو کی کمان زنانہ ہاتھوں یا کہنیوں میں ہو۔ الغرض یورپ میں کوئی منزل ایسی نہیں جس تک پہنچنے کے لئے دو چار عورتیں عبور نہ کرنا پڑتی ہوں۔

یہ تو ہے ان کی کثرت کی کیفیت۔ رہی ان کی بے پردگی، تو حاشا اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ پردے کا تمام تر بیڑا یہ اپنے ہاتھوں سے غرق کرتی ہیں اور اس تفصیل کے ساتھ کہ اگر میری جگہ کوئی آپ سا پرہیز گار ہوتا اور ان کا پردہ بحال کرنے لگتا تو آخر تھک ہار کر چلا اُٹھتا۔ "پنبہ کجا کجا نہم۔۔۔" بے شک ہم آپ ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جہاں چادر اور چار دیواری کا احترام قانوناً لازم ہے لیکن یقین جانیں ساری ولایت میں کہیں ایک چادر بھی نظر نہ آئی کہ تھوڑا سا احترام کر لیتے۔ چار دیواری کا احترام یوں بے سود تھا کہ چار دیواری خالی تھی اور جملہ پردہ نشیناں، بے چادر۔۔۔ اور تقریباً بے چولی۔۔۔ سرِ بازار نکل آتی تھیں۔ یوں تو مجھے چاہئے تھا کہ اس اشتعال کو صبر جمیل کے ساتھ برداشت کرتا اور خاموشی سے دیکھتا گزر جاتا لیکن غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ واپس آکر کچھ لکھ بھی دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کسی (بِدکے ہوئے) قاری سے

بات کروں تو اس کی زبانی معلوم ہوتا ہے جیسے ہر میم کا ستر۔۔۔ جو کبھی مستور نہ تھا۔۔۔مجھے مخاطب کر کے فریاد کر رہا ہے کہ

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر رہا

میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ مس سکاٹ میں

بدکے قاری کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن ازراہِ کرم مس سکاٹ کا سینہ تو جا کر ڈھانپ دیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

# حسینوں کی ذخیرہ اندوزی

لکھا یارِ طرحدار سیّد مشکور حسین یاد نے۔

"کرنل صاحب ہمیں حسینوں کا پردہ نشینوں کے ذکر پر کوئی اعتراض نہیں مگر ہر کتاب میں صرف ایک ہیروئن ہوا کرتی ہے۔ چلیں دو چار اس کی سہیلیاں بھی سہی۔ مگر آپ نے تو اپنی کتاب میں جہاں بھر کے حسین جمع کر لئے ہیں اور باقی قلمکاروں کے لئے ایک بھی نہیں چھوڑا۔ اتنی خود غرضی؟ آخر کیوں؟"

دوست عزیز، آپ کا ارشاد بجا۔ مجھے اپنی لغزش کا اعتراف ہے، لیکن یقین جانیں کہ حسینوں کی کثرت کے باوجود میری نیّت نیک تھی چنانچہ آپ خود شہادت دیں گے کہ

میں نے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو بطور مثال، جناب جوش یا دیگر حضرات نے اپنی حسینوں کے ساتھ کیا ہے۔ تاہم چینی اور چائے کی طرح حسینوں کی ذخیرہ اندوزی بھی ایک سماجی بُرائی ہے جس سے مجھے بچنا چاہئے تھا۔ آخر حسینوں پر دوسرے صارفین کا بھی برابر کا حق ہے، لیکن اب کہ یہ خطا ہو چکی ہے، بطور کفّارہ اپنے ذخیرے سے ایک آدھ چھوڑ کر باقی تمام حسین مفت بانٹنے کو تیار ہوں، مشکور بھائی، سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ سو، فرمائیں۔ جوڑی چاہئے یا بار برا؟ میرے خیال میں آپ کے لئے جوڑی موزوں رہے گی۔ ذرا شوخ ہے مگر آپ ہی کی طرح نکتہ سنج ہے۔ بالکل ستاروں کی طرح چہچہاتی جوڑی بنے گی۔ چشم بد دور!

لیجئے، دو حسینوں کے ہاتھ تو پیلے ہو گئے۔ باقی ماندہ کے لئے جملہ ادیب دوستوں کو صلائے عام ہے۔ ان دانوں پر کوئی ادیب ہاتھ رکھ سکتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ حاجتمند ہو۔ لیکن پہلے ہی سے دو چار حسیں گھر میں نہ ڈال رکھے ہوں۔ بس یہ شرط پوری کر دے اور ''پہلے آیئے، پہلے پایئے'' کے اصول پر اپنا حسین لے جایئے۔

## ہر سطر میں ایک دوشیزہ

فرمایا پیر و مرشد سیّد ضمیر جعفری نے۔

”بجنگ آمد میں تو کوئی اِکا دُکا عورت قاری کا راستہ کاٹتی تھی مگر بسلامت روی کی تو ہر سطر سے ایک تازہ دوشیزہ جھانکتی ہے۔ پھر ایک سے بڑھ کر ایک کافر ادا اور حشر ساماں۔ یوں لگتا ہے جیسے کرنل صاحب وقت گزرنے کے ساتھ کچھ زیادہ دِل پھینک ہو گئے ہیں۔“

پیر و مرشد دِل پھینکنے کی رفتار تو جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔۔۔ وہی دیرینہ بیماری، وہی ناکمی دِل کی۔۔۔ البتّہ یہ آپ نے بجا فرمایا کہ بسلامت روی میں زنانہ نمائندگی کی قدر زیادہ ہے، لیکن کسی قدر ہی۔ دوشیزائیں ضرور جھانکتی ہیں لیکن ہر سطر سے نہیں، کسی کسی صفحے سے۔ متعدد صفحات سے اچھے تکڑے تنومند مرد، بشمول ضمیر جعفری، مونچھیں مروڑتے، آنکھیں مارتے نظر آتے ہیں۔ خدا جانے یہ لوگ آپ سے کیوں اوجھل رہے؟ یا آپ کی نگاہِ حُسن جو دوشیزاؤں کے سوا کسی اور پر ٹھہری ہی نہیں۔ اور اگر واقعی نہیں ٹھہری تو آپ کی نگاہ کو قصور وار بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا!

ویسے، پیر و مرشد؟ آپ نے تو محض اندازے سے کام لیا ہے۔ ایک دوست نے بسلامت روی کی باقاعدہ مردم شماری کر ڈالی ہے یا یوں کہیں کہ اس کی جنس وار گنتی کر ڈالی ہے۔ نتائج بتاتے ہیں کہ کتاب میں کل چالیس عورتیں ہیں اور بہتّر مرد۔ اب کتاب میں کوئی آٹھ ہزار سطریں ہیں۔ اور سادہ تقسیم کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دو سو سطروں کے بعد بمشکل ایک عورت بر آمد ہوتی ہے اور پوری ۱۹۹ سطور میں کوئی

صورت نظر نہیں آتی، کوئی امید بر نہیں آتی۔ تو مرشد گرامی اگر دو صد سطور کے بعد، یعنی سیروں خون خشک کرنے کے بعد ایک مصرعِ تر کی صورت نظر آجائے تو کون سا غضب ہو گیا؟ اسے نہ تو زیادتی کہنا چاہیئے نہ دِل پھینکی۔۔۔ اور پھر حضور یہ ساری کی ساری دوشیزائیں بھی تو نہیں۔ پانچ سات کم سِنوں کو چھوڑ کر باقی ماندہ کی اوسط عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے ایک مفلوج ہے۔ دوسری کے منہ میں دانت نہیں۔ تیسری کو دیکھ کر کالے بکرے کی نیاز دینا پڑتی ہے۔ چوتھی چربی کے ہاتھوں قمیض میں سمائے نہیں سماتی اور پانچویں پر قمیص کے بغیر بھی آنکھ نہیں کھلتی۔ اور وہ جو چند مسلّمہ دوشیزائیں ہیں ان میں سے بھی بیشتر کی کششِ ثقل قابلِ برداشت سی ہے۔ یکسر غارت گر قسم کی دوشیزائیں دو چار ہی ہیں اور فرنگ میں یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں۔۔۔ بلکہ ایک دوست نے جب جنرل الف کے سامنے بسلامت روی کی حسیناؤں کی کثرت کی شکایت کی تو جنرل صاحب ایک حیرت کے عالم میں انگریزی میں چلّا اٹھے۔

"HOW CAN THE BEAUTIFUL WOMEN BE TOO MANY."

پھر اپنے جذبات کو اُردُو کا جامہ پہناتے ہوئے بولے۔

”او، خدا کے بندے۔ عورتیں ہوں اور خوبصورت بھی تو وہ زیادہ کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس طرح تو کل تم یہ شکایت کرنے لگو گے کہ آسمان پر تارے فالتو ہیں یا باغ میں پھول فاضل ہیں۔ نان سینس!“

اور پیر و مرشد گستاخی معاف ایک بات یاد دلاؤں؟ پچھلے دنوں جب آپ برطانیہ سے لوٹے تو آپ کی زبان سے بھی مردوں سے زیادہ میمیں جھڑتی تھیں۔ یاد ہے ناوہ رینا، وہ نینا، وہ انجیلا، وہ پامیلا اور وہ آپ کی یارِ خاص مسز ولیم جو آپ کے دِل و دماغ کے علاوہ آپ کی شاعری میں بھی گھس گئی ہے۔ یاد کیجئے ذرا اپنی نظم کا ٹیپ کا بند۔

مسز ولیم عجیب انداز کی خاتون تھی یارو

یہ نظم اب یار لوگ چمٹے کی لَے پر میلوں ٹھیلوں میں لگا رہے ہیں۔ گیت تو ہم نے بھی گائے تھے مگر خاصی مدھم لَے میں۔ اور وہ بھی صرف دوشیزاؤں کے، کہ زمانۂ قدیم سے یہی خوش ذوق سیّاحوں کی ریت ہے مگر حضور نے تو سالخوردہ حرافاؤں کو بھی لپیٹ میں لے لیا اور پھر ڈنکے کی چوٹ انہیں اپنے شاعری میں سمو لیا، مصرعوں میں پرو لیا اور گیتوں میں بلو لیا، مگر پیر و مرشد، یہ مرد کی طرف سے شکوہ یا طعنہ نہیں شاباش ہے کہ مسز ولیم جیسی ثقیل جنس کو ہضم کرنا آپ ہی کا جگرا تھا۔

# اگر عورت کو زندگی سے منہا کر دیا جائے

ارشاد ہوا بارگاہ شیخ عبدالشکور صاحب سے۔

"چلیں مان لیا کہ آپ کو سفر کے دوران مردوں سے زیادہ عورتوں سے پالا پڑا، لیکن کیا لازم ہے کہ رودادِ سفر لکھتے وقت ان تمام عورتوں کا، بلکہ ایک عورت کا بھی ذکر کیا جائے؟ کیا عورتوں سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا؟"

صاحب قبلہ، سچ پوچھیں تو نہیں کیا جاسکتا۔ مجبوری یہ ہے کہ یورپ کے بیان سے اگر عورت منہا کر دی جائے تو باقی کچھ بچتا ہی نہیں۔ یورپ کی کائنات میں بھی جتنا رنگ ہے، وجودِ زن ہی سے ہے۔ سو وہاں جا کر عورت سے کنارہ کرنا گویا زندگی سے کنارہ کرنا ہے اور رہبانیت کے تو غالباً آپ بھی قائل نہیں۔ قبلہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یورپ میں آپ کہیں بھی جائیں عورت سے مفر نہیں۔ گھر سے نکل کر باغ کا رُخ کریں یا بازار کا، قدم قدم پر کوئی گل پیرہن، کوئی شکر لب آپ کا راستہ کاٹے گی اور اگر آپ کسی ثقافتی تقریب میں جانکلے تو پھر گل پیرہنوں اور شکر لبوں کے طوفان میں گھِر جائیں گے۔ شیخ صاحب، ازراہِ انصاف فرمائیں ایسے طوفانوں کی روداد بیان کرتے ہوئے ان مسماۃ کو کیسے حذف کیا جاسکتا تھا اور یہ تو میرے بس میں نہ تھا کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جنس بدل دیتا۔

اگر گستاخی نہ سمجھیں تو قبلہ یہ بتائیں کہ کوئی آدمی فردوس سے لوٹے اور وہاں کی روداد بیان کرے تو حوروں کے سوا کسی کی بات کرے گا۔ تعریف کرے یا تضحیک، بات حوروں ہی کی ہو گی۔ غالب ہوں تو شاید بوڑھی حوروں کی شکایت بھی کر دیں لیکن مزے لے لے کر وہ بھی ان پری زادوں ہی کا ذکر کریں گے جو قدرت حق سے وہاں حوریں ہو گئیں۔ الغرض جنت سے لوٹ کر وحدت الوجود اور جبر و قدر پر کوئی کتاب نہیں لکھے گا۔ خواہ لوٹ کر آنے والے شیخ عبدالشکور بقلم خود ہی کیوں نہ ہوں۔ شیخ صاحب بھی بقدر ذوق، حور و قصور کے ہی قصّے سنائیں گے۔ اس خاکسار کو اصلی فردوس دیکھنے کا تو ابھی اتفاق نہیں ہوا مگر افرنگ ضرور دیکھا ہے اور اقبال کی شہادت ہے کہ افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند اور میں نے اس ارضی فردوس کی ایک طائرانہ اور شریفانہ سی جھلک دکھائی تھی۔ شریفانہ اس لئے کہ اس کی حوروں کا سراپا بے شک بیان کیا تھا مگر ان کی خوابگاہوں میں نہیں جھانکا تھا۔ اگر کسی جگہ ان کا سراپا بیان کرنے میں پردے کی کمی نظر آتی ہے تو یہ میری درخواست کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ان کی رضاکارانہ تنک پوشی کا کرشمہ تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ برائیٹن کی بیچ پر میں نے جملہ کم لباس یا بے لباس بیبیوں کیلئے کس صمیم قلب سے دعائیں مانگی تھیں کہ "الہٰی انہیں پردہ عطا کر۔ انہیں ایک شرعی فاصلے پر چلنے کی توفیق بخش اور بسرعت گزر جانے کی توفیق عطا فرما۔۔۔"

اور جب یہ دعائیں مستجاب نہ ہوئیں تو مضمحل و منفعل جسم و جاں لے کر اپنے ہوٹل کو لوٹا اور تمام رات مصلّے پر گزار کر اپنی روحانی مرہم پٹی کرتا رہا۔

# اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد

بہر حال حسینانِ فرنگ کے ذکر میں مجھ سے سچ مچ کوئی قصور ہے تو یہ اس نوع کا قصور ہے جو آج سے برسوں پیشتر ایک معروف ہستی سے ہوا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ ہم تو خیر جیسے خالی ہاتھ گئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ لوٹے مگر یہ حضرت ایک میم سے جھولی بھر لائے۔ میرا مطلب ہے اسے حبالۂ عقد میں لینے کے بعد۔ اس پر ہمارے دوستوں کی طرح ان کے بزرگوں نے بھی شکائتوں سے آسمان سر پر اٹھالیا، لیکن ایک بزرگ کہ صاحبِ نظر بھی تھے اور انصاف پرور بھی، ذرا بھی خفا نہ ہوئے۔ یہ بزرگ تھے شاعر بے بدل، لسان العصر اور بقول سیّد ضمیر جعفری اُردُو شاعری کے چیف جسٹس، جناب اکبر الہ آبادی اور موصوف دولہا سے نہ صرف خفا نہ ہوئے بلکہ اس کی صفائی میں ایک منظوم بیان بھی دیا جو ہمارے شعری ادب کا شہ پارہ ثابت ہوا۔ یہ نظم میں تبرکاً یہاں نقل کرتا ہوں کہ یہی میرا بیانِ صفائی بھی ہے تو سنئے جناب شیخ![۴۸]

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد

---

[۴۸] ان قارئین سے معذرت کے ساتھ جو یہ نظم پہلے پڑھ چکے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے دوبارہ پڑھ کر بھی وہ اتنے ہی لطف اندوز ہوں گے جتنے پہلی دفعہ ہوئے تھے۔ زاتی طور پر میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ اس طنز و مزاح کے شہنشاہ کو اپنی کتاب میں مہمان کیا ہے (مصنّف)

اس خطا پر سن رہا ہوں طعن ہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسلِ قوم

کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بد خصال و بد معاش

دِل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ

ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو

قومِ انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو

سوپ کاری کے مزے لو چھوڑ دو یخنی و آش

لیڈروں سے مل کے سیکھو ان کے انداز و طریق

ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش

بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خم پہ خم

ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا

جس سے تھا دِل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر

ہاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

اس کی چتون سحر آ گئیں، اس کی باتیں دلربا

چال اس کی فتنہ خیز، اس کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغِ آتش رخ جس کے آگے آفتاب

اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برقِ بلا

دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خون فتنہ زا

دِل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے اکبر میرے دِل میں یہ خیال

حضرت سیّد سے جا کر عرض کرنا کوئی کاش

در میان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای

باز میگوئی کے دامن تر مکن ہشیار باش

کوئی اثر ہوا، جناب شیخ؟ اور دیکھیں یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب انگستان وکٹوریائی پرہیز گاری کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ یعنی لوگ جائز ناجائز میں تمیز کرنے کے علاوہ کپڑے وغیرہ بھی پہنا کرتے تھے۔ میں نے ساٹھ سال بعد کا فرنگ دیکھا جب سارا یورپ PERMISSIVE (سب جائز ہے) شاہراہ پر رواں تھا۔ اس جلوس میں اکثر مردوں کا لباس فقط انجیر کا پتّہ تھا اور اکثر خواتین ایک پتی کی روادار بھی نہ تھیں۔ یہاں آپ دامن کے چاک اور گریبان کے چاک کا درمیانی فاصلہ ناپتے رہتے ہیں۔ وہاں اب دامن ہے نہ گریباں۔ فاصلے معدوم ہو گئے ہیں۔ قرب مکمل ہے۔ باز میگوئی۔۔۔؟

شکوہ کیا جناب خواجہ عبدالرؤف نے۔

”چلیں، آپ نے عورتوں کا ذکر کیا ہے، معاف کئے دیتے ہیں کہ عورتیں بھی معاشرے کا حصّہ ہیں لیکن جو کچھ معاف نہیں کیا جا سکتا، وہ آپ کا مزے لے لے کر بیان کرنا ہے۔ آپ کی تحریر میں تلذز کا شائبہ ہے۔ کیوں؟“

رعایت کا شکریہ۔ رہا بیان میں تلذز کا شائبہ تو بندہ پرور گزارش کمترین کی یہ ہے کہ تلذز تو قاری کے دِل میں ہوتا (یا نہیں ہوتا) ہے جسے وہ حسبِ توفیق محسوس کرتا ہے۔ شراب کے ذکر پر مے نوش سر دھنتا ہے اور زاہد سر پیٹ لیتا ہے۔ میں نے تو جسے جس حال میں دیکھا، بے کم و کاست بیان کر دیا۔ اور خواجہ صاحب، گستاخی معاف دراصل میرے مخاطب خوش ذوق، کشادہ دِل اور خطا بخش دوست تھے۔ نہ کہ کم ظرف چڑچڑے اور تھڑُدِلے لوگ جو فطرتاً حسِ لطیف سے محروم ہوتے ہیں۔۔۔ ہم ان کے حق میں فقط دعا ہی کر سکتے ہیں۔۔۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ عورتوں کے ضمن میں اس خاکسار کی نثر پر سیخ پا ہونے والے حضرات غالب اور سراج الدین ظفر کے مندرجہ ذیل اشعار پر تو اپنا سر نوچ لیتے ہوں گے۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

غالب

ہمارے دوش پہ کھلتی تو تیری زلف سے ہم

نسیمِ صبح کے لہجے میں گفتگو کرتے

سراج الدّین ظفر

کیا فرماتے ہیں خواجہ صاحب؟ آپ کے لئے تو شاید یہ اشعار انتہائی تلذز کا سامان بہم پہنچائیں گے مگر اہلِ دِل کے نزدیک یہ سچے فنکاروں کا نذرانۂ عقیدت ہے جو انھوں نے خلوص میں ڈوب کر حُسن کی بارگاہ میں پیش کیا ہے۔ سو قبلہ جیسا کہ وہ انگریزی میں کہتے ہیں۔ یہ خاکسار اچھی کمپنی (صحبت) میں ہے۔ ہاں آپ کو اعتراض کا بھی پورا حق ہے اور بڑے شوق سے کریں۔ سر تسلیمِ خم ہے۔ مگر بے چارے دِل کے مارے شاعروں اور ادیبوں پر لذّت گیری کا الزام ہے ذرا زیادتی۔ ان دیوانوں نے تو ہر حسین چیز کو دیکھ کر پھڑک اُٹھنا اور پھر جو دِل پہ گزرتی ہے اسے رقم کرتے رہنا ہے۔ حُسن مستور ہے تو مجال ہے یہ لوگ محض پھڑک اٹھنے کی خاطر نقاب جا اُلٹیں یا الٹوائیں۔۔۔ وہ بوالہوس نہیں۔۔۔ حسینوں کی بے حجابی سراسر ان کی اپنی رضا ہے اور سچ پوچھیں تو قصور حسینوں کا بھی نہیں، خود فطرت کا بھی یہی تقاضا ہے۔

کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

(اقبال)

# فوجی ہو کر عشق و مستی کی باتیں؟

فرمایا جناب ایس۔ ایف۔ شمس ریٹائرڈ سی۔ ایس۔ پی نے۔

"بھئی حیرت اس بات پر ہے کہ ہو تو تم ایک فوجی، لیفٹ رائٹ کرنے والے اور مورچے کھودنے والے اور باتیں کرتے ہو گلعذاروں کی اور مہ پاروں کی اور وارداتیں کرتے ہو عشق و مستی کی۔ تمہیں کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ عشق بازی؟"

راہ و رسمِ عشق بازی کی تھوڑی سی خبر اس لئے ہے کہ یہ خاکسار فوجی ہو کر انسان ہونے سے محروم نہیں ہو گیا۔ اگر آپ کے خیال میں فوج ایسی مخلوق ہے جو مریخ یا مُشتری سے اُڑن طشتریوں کے ذریعے پاکستان میں اُتر کر چھاؤنیوں پر قابض ہو گئی ہے تو بصد ادب گزارش ہے کہ یہ درست نہیں ہے۔ فوجیوں کو ذرا غور سے دیکھیں تو یہ آپ ہی کی نسل کے لوگ ہیں۔ سوائے اس کے کہ شاید آپ کے بال ان سے لمبے ہوں اور ان کی رعونت آپ سے چھوٹی ہو ورنہ ان کے سینے میں بھی وہی دِل ناصبور دھڑکتا ہے جو آپ کے سینے میں ہو کے بھرتا ہے اور گلعذاروں اور مہ پاروں کی محبّت میں ان کا دِل بھی آپ ہی کی طرح گداز ہوتا ہے۔۔۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد سر ضرور منڈوانا پڑتا ہے، مگر دِل نہیں منڈوایا جاتا۔ علاوہ ازیں فوجیوں کو فقط ہتھیار پھینکنا ممنوع ہے، دِل پھینکنا ممنوع نہیں۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی ضد ہے کہ فوجیوں کے سینے میں دِل کی جگہ پتھر ہوتا ہے تو پھر یہ سارا قصور حسینوں کا ہے جو ایک فوجی کو بھی موم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ آخر اقبال ہی کی دریافت ہے کہ

یہ چیز وہ ہے جو پتھر کو بھی گداز کرے

فرمایا ایک درد مند اور دیدار فوجی افسر میجر مرزا نے۔

”محترم کرنل صاحب۔ چند سال قبل آپ کی بجنگ آمد پڑھی اور آپ مجھے تاج محل کے سب سے اونچے چوبارے (منار؟) پر بیٹھے نظر آئے۔ کچھ دن ہوئے آپ کی بسلامت روی ملی۔ بصد احترام پڑھنا شروع کیا۔ جب دیکھا کہ آپ انگلستان جیسے ملک سے جامِ مَے چھوئے بغیر واپس آ گئے تو ایک کے مومن کو سراہتے ہوئے دو آنسو بہہ نکلے۔ عقیدت کے آنسو! لیکن آپ نے یہ کیا ظلم کیا کہ ایران آ کر یعنی اپنے گھر کی دہلیز پر پہنچ کر رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کر پی گئے؟ (بسلامت روی صفحہ ۳۱۲) آپ کے لئے جو میں نے خیالی تاج محل تعمیر کیا تھا دھڑام سے گر گیا۔ کاش آپ ایسا نہ کرتے! صفحہ ۳۱۲ سے آگے میں نے ایک لفظ بھی نہ پڑھا۔ کتاب وہیں بند کر کے الماری میں رکھ دی کہ اب آپ کا سارا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔“

میرا جواب تھا۔

”محترم میجر صاحب آپ کی اس نوازش کا شکریہ کیسے ادا کروں کہ آپ نے بجنگ آمد پڑھنے کے بعد مجھے تاج محل کے سب سے اونچے منار پر بٹھا دیا (ویسے منار پر بٹھانا اتنا مشکل نہیں جتنا بیٹھنا تکلیف دہ ہے!) لیکن ساتھ ہی ایک چھوٹا سا شکوہ کیوں نہ کروں کہ آپ نے مجھے وہ مقام بخش دیا جس کا میں اہل نہ تھا۔ مجھ میں کوئی خاص بات تو تھی نہیں۔ وہی خوبیاں اور خرابیاں جو دوسرے فوجی افسروں میں پائی جاتی ہیں مجھ میں بھی ہیں۔ مگر ایک بات: میں نے کبھی پی نہیں۔ آپ پوچھیں گے بلکہ پوچھا ہے کہ پھر یہ جگر کا مصرع کہاں سے آ گیا۔

رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

جی ہاں یہ مصرع ایک ذاتی مشکل کا حل تھا۔ آپ نے میری دونوں کتابوں کے مطالعہ سے محسوس کیا ہو گا کہ ان میں واقعات بالکل معمولی سے ہیں۔ ان میں کچھ کشش ہے تو اندازِ بیان کی وجہ سے ہے۔ یعنی ان میں اہم شے داستان نہیں داستان گوئی ہے۔ اسی داستان گوئی کے ریلے میں یہ خاکسار، طوعاً و کرہاً ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں انکارِ مے سے بات کچھ بنتی نہ تھی۔ صاف اقرار بھی گوارا نہ تھا کہ کبھی پی نہ تھی، لہٰذا بیان کی شاعرانہ اٹھان کے پیشِ نظر جگر کے مصرع کا سہارا لیا۔

خیال تھا کہ نکتہ رس قاری اسے شاعرانہ خیال آرائی سمجھ کر معاف کر دے گا جیسا کہ تمام غزل گو شاعروں کی معاف کر دیا جاتا ہے، حالانکہ کوئی معقول شاعر ایک آدھ بوتل لہریا یا تھرّا کر پیئے بغیر، مطلع سے مقطع تک نہیں پہنچا اور ان اعزازیِ مے نوشوں میں بڑے بڑے پرہیز گار، بزرگوار اور ریش بردار شعرا (مع "بہ مے سجادہ رنگین کن" والے جناب حافظ شیرازی) بھی شامل ہیں جنہوں نے غالباً کبھی خالی بوتل کو بھی نہیں چھوا۔ لیکن آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو سچ مچ میرے گلاس میں سکاچ نظر آئی۔ ان حالات میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اظہارِ معذرت کروں اور یہ وعدہ بھی کہ آئندہ ایڈیشن میں تلافی کر دوں گا۔ خیر اندیش۔"

اور سچ مُچ اگلے ایڈیشن میں محترم میجر صاحب کی خاطر اپنا گلاس کوکا کولا سے بھر لیا۔۔۔ کتنی مشکل زندگی ہے: شعر میں شراب پینا جائز ہے مگر نثر میں حرام ہے۔

جیسا کہ ہمارے یار مشتاق احمد یوسفی نے زرگزشت میں لکھا ہے، خرابی دراصل یہ ہے کہ جو باتیں شعروں میں کی جاتی ہیں اگر نثر میں بھی اسی بے تکلّفی سے کہہ دی جائیں تو پولیس اور نقّاد تو بعد میں آئیں گے، خود بیوی، ابتدائی رپورٹ پر ہی آپ کی ہڈی پسلی ایک کر دے گی۔ بہر حال پولیس اور

بیوی سے تو ہم وقت آنے پر نبٹ لیں گے، میجر صاحب سے غیر مشروط توبہ کئے ہی بنی۔ مگر یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ قبلہ میجر صاحب نے بکمال فراخدلی ہمیں چالیس عورتیں تو بخش دیں۔۔۔ اور بدستور تاج محل کے چوبارے پر بٹھائے رکھا۔۔۔ مگر نہ بخشا تو ایک گھونٹ شراب کا جو شراب بھی نہ تھی اور پھر

ثریّا سے زمیں پر محترم میجر نے دے مارا

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ شراب جو میجر صاحب نے پکڑی، کتاب کے صفحہ ۳۱۲ پر پائی گئی جہاں آپ نے عالمِ بیزاری میں کتاب بند کر کے الماری میں ڈال دی اور احتجاجاً آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ مگر آپ، ازراہ عفو، مطالعہ جاری بھی رکھتے تو آگے پڑھنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ یہی تو کتاب کا تقریباً آخری صفحہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ناراض ہونے سے پہلے آپ نے ساری کتاب اطمینان سے پڑھ لی۔ گویا آخری لمحے میں کتاب کو الماری میں بند کر دینا محض علامتی احتجاج تھا۔ ویسے میجر صاحب کی جگہ میں ہوتا تو ایسی حرام شے کو الماری میں رکھنے کی بجائے یا تو دریابُرد کر دیتا یا کسی پرمٹ رکھنے والے (غیر مسلم) مَے نوش دوست کو دے دیتا۔

# تیسری جنگِ عظیم مکالماتی!

بسلامت روی کی عورتوں کی کثرت کا جرم ہر چند کہ بہت سنگین نہیں، تاہم ایسا ریشمیں بھی نہیں۔ بہتّر مردوں کے مقابلے میں چالیس عورتیں کم سہی، لیکن چالیس عورتیں آخر چالیس عورتیں ہوتی ہیں۔ عورت ایک بھی ہو تو موافق حالات میں قیامت برپا کر

سکتی ہے۔ چالیس عورتیں تو ریاضی کی رو سے چالیس قیامتیں کھڑی کر سکتی ہیں۔ چنانچہ اس موضوع نے میرے دوستوں میں جو ہمیشہ سخن فہموں اور طرفداروں میں بٹ جاتے ہیں، عجیب عجیب مناظروں کو جنم دیا ہے۔ ایک مناظرہ جو محبی ریحان مرزا اور مشفقم انوار تابش کے درمیان منعقد ہوا، ذکر کے قابل ہے۔

ریحان مرزا اور انوار تابش میرے ہی دوست نہیں، آپس میں بھی یار ہیں اور بڑے بے تکلّف۔ شعر و ادب کے ساتھ دونوں کا رشتہ ہے مگر مختلف قسم کا۔ ریحان مرزا محض ایک خوش ذوق قاری ہیں اور کتابوں سے محض حظ اخذ کرتے ہیں، کیڑے نہیں نکالتے خواہ دو چار کیڑے نظر آ بھی جائیں۔ بخلاف اس کے انوار تابش پیشہ ور نقّاد ہیں اور محض کیڑوں مکوڑوں کی تلاش میں کتابیں پڑھتے ہیں۔ دونوں تیز طبع جوان ہیں لہٰذا کسی موضوع پر تنازعہ ہو جائے، جو اکثر ہو جاتا ہے، تو پھر باقاعدہ ایک مکالماتی جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تابش مدِّ مقابل کو ریحان مرزا کی بجائے خفقان مرزا سے خطاب کرتے ہیں اور مرزا، انوار تابش کو انوار خارش کہہ کہ پکارتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ان کی باہمی بے تکلّفی ہے اور دوسری یہ کہ اگر تابش بے انصافی کی حد تک عیب جو ہیں تو مرزا بے وقوفی کی حد تک صاف گو ہیں۔ اخبار نوائے وقت جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہے یا نہ کہے، ریحان مرزا جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کے علاوہ کلمۂ ناحق بھی کہہ ڈالتے ہیں۔۔۔ اور کرنا خدا کا ایک دن کیا ہوا کہ انوار تابش میرے پاس آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ریحان مرزا بھی آ نکلے۔ دو قطبین کو یکجا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج

تیسری جنگِ عظیم چھڑنے کا امکان ہے۔ فقط میری موجودگی قیامِ امن کی کمزور سی ضمانت تھی۔ کمزور اس لئے کہ برژنف اور کارٹر بھر چاہئیں تو بے چارے والڈ ہائم ذرا زور سے سیٹی ہی بجاسکتے ہیں اور

سیٹیوں سے رام ہو سکتی ہیں شمشیریں کہیں؟

ابتدا تو جناب تابش نے بڑے خوشگوار مصرعِ طرح سے کی۔ حضرت کرنیل، کیا کچھ لکھ رہے ہیں آج کل؟ جواب عرض کیا لیکن جیسا کہ اس محفل میں ناگزیر تھا، بات گھوم پھر کر بسلامت روی کی جوانی تک آ پہنچی اور تابش میاں نے حسبِ عادت پہلا کیڑا نکالا:

"کرنل صاحب۔ آپ اچھی بھلی کتاب لکھ چکے تھے۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں بجنگ آمد، مگر بسلامت روی لکھ کر تو آپ نے عزّتِ سادات گنوادی۔ آپ نے سخت زیادتی کی ہے، قارئین سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔"

جناب تابش کی عیب جوئی کوئی نئی بات نہ تھی مگر لہجہ ہمدردانہ تھا۔ مجھے تجسّس نے گُدگدایا اور پوچھا۔

"بزرجمہر۔ آپ نے کتاب پڑھی۔ ذرا اس زیادتی کی نشاندہی فرمادیں تو جج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی۔"

بولے: ”دیکھیں صاحب، تین باتیں ہیں۔ ایک تو اس کتاب میں آپ کے طرزِ بیان میں ناروا شوخی بلکہ شرارت ہے جو فعل شنیع ہے۔ دوسرے آپ نے جام و سبو کی باتیں کی ہیں جو فعلِ قبیح ہے اور سب سے بڑھ کر فرنگ کے بیان میں عورتوں کا پے در پے ذکر کیا ہے حالانکہ وہاں غالباً مرد بھی پائے جاتے ہیں۔ الغرض یوں لگتا ہے جیسے آپ کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ معاف کیجئے گا، شرع کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کو شریعت کے سامنے پیش کیا جائے۔“

یہ دھمکی دی اور جناب تابش جج کا ثواب بٹور کر چائے پینے لگے جو ابھی سیف علی[۴۹] بنا کر لایا تھا۔

یہ اعتراضات ذرا ملائم شکل میں میں نے پہلے بھی سُنے تھے لیکن سچّی بات ہے جب میں نے ایک پیشہ ور نقّاد کی زبان سے یہ سنگین فردِ جرم سُنی تو ایک لمحے کے لئے ۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ ۔۔۔ بھونچکا سا رہ گیا کیونکہ مجھے ان تینوں جرائم، خصوصاً تیسرے جُرم کا احساس نہ تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے قاری محترم، آپ کو راہ جاتے کوئی تابش نما آدمی بازو سے پکڑ کر کہے، آیئے ادھر تھانے میں۔ آپ نے فلاں خاتون کی آبروریزی کی ہے اور خاتون کا کوئی وجود ہی نہ ہو! اب آپ ہی بتائیں ایسی صورتِ حالات میں آپ کی پیٹھ پر کوڑے اور ذہن میں کیڑے نہ رینگنے آئیں گے؟ مگر پیشتر اس کے کہ میں تابش کو

---

[۴۹] مصنّف کا وفادار ملازم

ٹھنڈے دِل کے ساتھ کچھ صفائی پیش کرتا، ہمارے یار مرزا نے کھولتے دِل کے ساتھ ایک سوال داغ دیا۔ یعنی چائے کی پیالی کو لبوں کے قریب روک کر تابش سے مخاطب ہوئے:

"کیا کہا، خارش میاں، مصنّف کے اعصاب پر کیا سوار ہے؟"

تابش ڈٹ کر بولے: "عورت، خفقان میاں، عورت! دیکھتے نہیں کہیں الزبتھ ہے، کہیں باربرا، کہیں جوڈی ہے، کہیں سوزن۔ یوں لگتا ہے جیسے مصنّف کے سامنے عورتوں کا کیو لگا ہوا ہے اور وہ یکے بعد دیگرے ان کا طبّی معائنہ کر رہا ہے۔ لیکن جب ایک سے فارغ ہوتا ہے تو کہتا ہے۔ "NEXT PLEASE"[۵۰] اور کھٹ سے اگلی عورت منہ کھولے، آآ کرتے ٹانسل (TONSILS[51]) دکھانے لگتی ہے۔"

مرزا بولے۔ "بس۔ بس۔ بس۔ عورت کے ٹانسل دیکھنا تو کوئی جرم نہیں۔ تمہارا بنیادی اعتراض یہ ہے کہ کتاب میں عورتیں زیادہ ہیں۔ ٹھیک؟"

"بالکل ٹھیک۔ اور کمال ہے خفقان میاں۔ تم ایک ہی سانس میں میری بات سمجھ گئے ہو۔"

---

[۵۰] اگلا یا اگلی آئے۔

[51] گلا۔

تابش کو مرزا پر اپنی نقّادانہ فضیلت کا ایک جاندار مغالطہ تھا لیکن مرزا، تابش کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے سقراطی لہجے میں بولا۔

"دیکھو خارش۔ اگر تمہارے خیال میں عورتیں زیادہ ہیں تو کس سے زیادہ ہیں؟"

"میں سمجھا نہیں۔" تابش ذرا حیران ہو کر بولے۔

مرزا: "میں سمجھاتا ہوں۔ کیا شرع نے کوئی حد مقرر کر رکھی ہے کہ ایک کتاب میں صرف اتنی عورتوں پر غور کیا جا سکتا ہے؟"

تابش: "نہیں ایسا تو کوئی حکم نہیں۔"

مرزا: "تو کیا ان خرگوشوں سے زیادہ ہیں جو بطور مثال پاکستان یا سری لنکا میں پائے جاتے ہیں؟"

تابش: "عورتوں کا خرگوشوں سے کیا رشتہ؟"

مرزا: "رشتہ تعداد کے مقابلے کا تھا مگر تم یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں کتاب میں الزبتھ نظر آئی، جوڈی اور باربرا دکھائی دیں مگر کیا وجہ ہے کہ کسی مرد پر نگاہ نہیں ٹھہری؟ مثلاً وہ پنڈی والے جناب خونخوار، وہ کراچی والے آغا میخوار، وہ تاج محل والے یوسفی، وہ جہاں گرد ابن انشا، وہ کالے چشمے والے حکیم محمد سعید، وہ انگلستان

والے گولڈ ہل، میجر جینکن اور کرنل کومب، وہ استنبول والے چچا چقما گلو، وہ ایران والے پرویز اعتمادی اور بھائی کرپال سنگھ اور وہ پاکستان والے اپنے سیّد ضمیر جعفری۔۔۔ یہ بیسیوں ہٹّے کٹّے مرد۔ کیا انہیں دیکھنے کے لئے تمہیں خوردبین درکار تھی؟"

تابش پہلی دفعہ ذرا معذرتی انداز میں بولے۔

"بھئی سچی بات ہے یہ لوگ تو مجھے بھول ہی گئے تھے۔"

مرزا بولے: "بالکل۔ اور تم بھولے انہیں اس وجہ سے تھے کہ مصنّف سے کہیں زیادہ تمہارے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ الزبتھ کو تو بڑی ذہن نشین جنس پاتے ہو مگر کرنل فورڈ کو پٹھّے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتے۔"

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا

کہ اس میں الزبتھیں، جوڑیاں اور باربرائیں تھیں

میں مرزا کے منہ سے طبع زاد شعر سن کر حیران ہوا کہ وہ آج تک اپنے مخالفین پر تمام تر غصّہ نثر ہی میں نکالتے تھے۔ تابش بھی ذرا مرعوب ہو گئے اور بولے۔

"ارے خفقان، بڑے منظوم حملے کرنے لگے ہو۔"

مرزا نے اطمینان سے جواب دیا "تھوڑی دیر ہوئی وہ شنیع اور قبیح والی نثری نظم تم نے بھی کہی تھی۔ خارش میاں، میں تو محض جواب آں غزل دے رہا ہوں۔ ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے۔"

تابش بولے: "بڑی روانی ہے آج طبیعت میں ماشاء اللہ"۔

مرزا نے ایک بار پھر تابش کی طنزیہ تحسین کا نوٹس نہ لیا اور گفتگو جاری رکھی۔

"دیکھو خارش۔ کبھی کسی کتاب میں عورت کا ذکر آ جائے تو تم چلّا اٹھتے ہو کہ مصنّف کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ مرد اور عورت کے درمیان ازلی اور فطری رشتہ ہے یا نہیں؟"

تابش بولے: "ہے۔"

"اور یہ بھی مانتے ہو کہ فطرت ہی نے انہیں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہونے کا احساس دے رکھا ہے؟"

"بالکل مانتے ہیں۔"

"اور یہ کہ اس کلیہ سے دنیا کی محترم ترین ہستیاں بھی مستثنٰے نہیں؟"

"یہ بھی درست ہے۔"

”اگر یہ سب درست ہے تو گستاخی معاف، خارش میاں، جس مرد کے اعصاب پر عورت سوار نہیں وہ یا تو نامرد ہے اور یا جھوٹا ہے۔“

ہر چند کہ مرزا کی دلیل جاندار تھی تاہم جن الفاظ میں بیان کی گئی تھی، ضرورت سے زیادہ جاندار تھے اور نقصِ امن کا اندیشہ تھا۔ میں نے مرزا کا بازو تھاما اور کہا۔

”شانتی، مرزا، شانتی!“

مرزا بولے۔ ”ان سخت الفاظ کی معافی چاہتا ہوں کہ بقول اقبال

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا

جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات“

تابش بولے۔ ”لو یہ بے اعتدالی بھی اقبال کے کھاتے میں گئی۔ یہ اندازِ گفتگو اور گلہ کرتے ہو نقّادوں کا؟“

”صرف تم جیسے بے اصول نقّادوں کا۔ ورنہ شائستہ ناقدین کو تو سلام کرتا ہوں۔“

”یہ شائستہ نقّاد بھلا کیا جنس ہوتی ہے خفقان میاں؟ اس کی پہچان؟“

”شائستہ نقّاد کی پہچان میرے پیارے خارش یہ ہوتی ہے کہ وہ مصنّف سے اختلاف تو کرتا ہے، مگر اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ یعنی اس کی تنقید ہمدردانہ ہوتی ہے۔ مخاصمانہ نہیں ہوتی۔ اب سمجھے ہو اختلاف اور مخالفت کا فرق یا ڈکشنری لاؤں؟“

”تو میں نے کیا مخالفت کی ہے؟“

”کسی کو کہنا کہ تمہارا یہ فعل شنیع ہے، فلاں حرکت قبیح ہے، تم پر فلاں شے سوار ہے۔ کیا یہ قصیدے کے بند ہیں؟ کیا کسی کو شریعت کورٹ میں لے جانا پیار کی علامت ہے؟“

تابش کسی قدر گھبرائے مگر جلد ہی سنبھل کر بولے۔

”ٹھیک ہے میں نے سب کچھ کہا ہے مگر ہو سکتا ہے میری روح کے اندر بھی ایک عارضی سا تلاطم آگیا ہو۔“

”بجا کہتے ہو خارش میاں، تمہاری روح تو کُل وقت تلاطم میں رہتی ہے اور معلوم ہے کیوں؟“

”خفقان میاں ہی فرمادیں۔ میں نے تلاطموں کا بہت گہرا مطالعہ نہیں کیا۔“

”تو سنو۔ تمہاری روح میں اس لئے تلاطم برپا ہے کہ تم چھڑے ہو۔ یعنی بے جورو کے ہو۔ تم عورت سے الرجک محض دکھاوے کے لئے ہو ورنہ تمہارے لاشعور میں عورت

ہی بستی ہے اور اس کی محرومی کی وجہ سے تم ان لوگوں پر دانت پیستے رہتے ہو جنہیں خدا نے اس دولت سے آسودہ کیا ہے۔"

پھر اچانک مرزا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کرنل صاحب، خارش کی کسی اچھی جگہ شادی نہ کرادی جائے؟"

میں نے کہا۔ "تابش صاحب حکم کریں تو ابھی سے کسی مہ وش کی تلاش شروع کی جاسکتی ہے، بلکہ انگلستان سے ایک آدھ الزبتھ بھی منگوائی جاسکتی ہے۔"

اس پر کیا دیکھتے ہیں کہ شادی کے اس فرضی منصوبے نے تابش کے چہرے کو ایک مستانی سی مسکراہٹ میں نہلا دیا ہے۔ یہ دیکھ کر مرزا نہ رہ سکے۔ مجھے کہنے لگے۔

"اللہ، ایک حریص چھڑے کے لئے شادی کا تصوّر کس قدر سحر انگیز ہو سکتا ہے۔ ذرا دیکھیں، شادی کی بھنک پر اس فاضل نقّاد کی پیشگی مسکراہٹ! آپ نے الزبتھ کا نام لے کر گویا اس کی دُکھتی غیر شادی شدہ رَگ پر مرہم رکھ دیا؟ ولائتی مرہم! اگر سچ مُچ اسی لمحہ الزبتھ وارد ہو جائے تو یہ نک چڑھا نقّاد سو بار الحمد للہ پڑھ کر اسے اعصاب کے علاوہ سر پر سوار کرلے گا۔ لیکن اگر اس لڑکی کی نظرِ التفات آپ پر یا مجھ پر ٹھہر گئی تو یہ اچھا بھلا خوش مذاق فاسق، یکلخت واعظ یعنی نقاد کا روپ دھار لے گا اور لاحول پڑھتے ہوئے

چلّا اٹھے گا۔ ”ان لوگوں کے اعصاب پر تو الزبتھ سوار ہے۔۔۔“ الغرض جو الزبتھ، خارش پر مائل نہیں، سخت کھٹی الزبتھ ہے اور کسی نہ کسی پر سوار ہے۔“

لیکن تابش اب مناظرے سے تقریباً دست بردار ہو چکے تھے۔ اب وہ تھے اور ممکنہ شادی کی خوشی میں ان کی خودرو مسکراہٹیں جو ان کے چہرے سے پٹرول سے بھی نہیں پونچھی جاسکتی تھیں۔ مرزا تابش کو دیکھ کر مسکرایا اور پھر اچانک مجھ سے سوال پوچھا۔

”کرنل صاحب۔ خارش نے ابھی کہا تھا کہ آپ کی بجنگ آمد تو اچھی خاصی کتاب تھی مگر بسلامت روی لکھ کر آپ نے عزّتِ سادات گنوادی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

کہا۔ ”مرزا بطور مصنّف تو میں سمجھتا ہوں کہ اسلوبِ بیان اور اندازِ فکر کے اعتبار سے بسلامت روی بجنگ آمد سے بہتر ہے، لیکن بسلامت روی کی کچھ باتیں جو صیغہ واحد متکلم میں لکھے جانے کی وجہ سے خودستائی سی لگتی ہیں، بعض نقّاد دوستوں کو خوش نہیں آئیں۔ مثلاً باربرا، مسز ”ش“ اور جوڈی وغیرہ سے ہمارے مکالمات و معاملات۔ اگر یہی باتیں ہم اپنی جگہ کسی اصلی یا فرضی دوست کے کھاتے میں ڈال دیتے تو یہی نقّاد دوست ہماری خوش بیانی کی داد دیتے۔ آخر بجنگ آمد میں بھی ایسے ہی مکالمات اور معاملات تھے، مگر وہ تمام تر ورما، انکل ”ن“ اور دوسرے دوستوں سے منسوب تھے اور ہمیں محض خوش بیان راوی سمجھ کر نقّادوں نے سونے کا تمغہ بخش دیا۔۔۔ یہ سارا کام صیغہ واحد متکلم یعنی ”میں“ نے خراب کیا ہے۔

"یہ صیغوں والی بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی۔" مرزا نے پُرجوش تائید کی۔ افسانہ نویسوں کو جو بیشتر صیغۂ غائب میں لکھتے ہیں۔ یہ خارش برادری سب کچھ معاف کر دیتی ہے۔ ایک افسانہ نگار ایک خوبصورت ہیروئین کو ایک زشت رو اجنبی کے ساتھ اٹھا، بٹھا بلکہ بھگا بھی سکتا ہے، مگر نقّادوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ آخر یہ زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ ہر روز کی واردات ہے۔ چلیں یونہی سہی۔ مگر ایک سفر نامہ نگار دورانِ سفر کسی لڑکی سے ہنس کر بات کرنے کا تذکرہ بھی کر بیٹھے تو اسے غیر شرعی فعل سمجھتے ہیں کہ مصنّف صیغہ واحد متکلم میں بزبانِ خود اقرارِ گناہ کر رہا ہے۔ چنانچہ خارش ایسے نقّادوں سے اگر مُستنصر حسین تارڑ کو سو میں سے سو نمبر لینے ہیں تو اسے چاہیے کہ کسی ہسپانوی حسینہ کو دیکھتے ہی دو رکعت نفل نیت لے ورنہ اگر اس نے لڑکی کو ہیلو کہہ دیا تو مستنصر کا کردار مشکوک ہے اور عاقبت مخدوش۔ اِدھر منٹو اپنے افسانے میں کسی رئیس زادی کو اس کے نوکر کے بستر میں سلائے رکھے تو یہ زندگی ہے، آرٹ ہے، لیکن کوئی رقیق القلب زولا سفر فرانس کے تھکے مسافر عطاالحق قاسمی کی کمر مل دے اور وہ اس واقعہ کو اپنے سفر نامے میں چند خوبصورت جملوں میں بیان کر دے تو یہ آرٹ نہیں زندگی بھی نہیں۔ فحاشی ہے! ہماری اُردُو کی ایک مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار خاتون ہیں جن کی کسی ہیروئین کی عصمت ان کے قلم سے محفوظ نہیں اور اگر ان کی تمام تر متاثرہ ہیروئینوں کو حساب میں لیا جائے تو مصنّفہ نے عصمت دریوں کی سنچری مکمل کر لی ہے، لیکن آج تک کسی ادبی امپائر کو توفیق نہیں ہوئی کہ اپنی انگلی اٹھا کر محترمہ کو ایل بی

ڈبلیو قرار دے دے۔ اس کے بر عکس جب محمد کاظم نے اپنے سفر نامے میں لکھا کہ میں جرمنی میں ایک مخلوط کیو میں کھڑا تھا کہ پشت پر دو نرم اُبھاروں کا لمس محسوس ہوا تو جملہ ناقدین کے سینوں پر سانپ لوٹے گئے اور محمد کاظم کو عریاں نویسی کے طعنے دینے لگے۔ الغرض یہ خارشی نقّاد۔۔۔"

میدان اب مکمل طور پر مرزا کے ہاتھ میں تھا۔ تابش اپنی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ فتح و شکست سے بے نیاز، الزبتھ و مافیہا میں گم تھے۔ چنانچہ جابر سلطان کو خارج از بحث سمجھ کر مرزا اب کلمۂ حق کے علاوہ کلمۂ ناحق پر بھی اتر آئے تھے اور مجھے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ شاید اس لئے کہ آپ نے اس جنگ کا آغاز میری خاطر ہی کیا تھا۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"مرزا۔ طرفداری کا شکریہ۔ تمہاری دلیلیں بیشک بے پناہ ہیں مگر تابش کی باتوں میں بھی جان ہے"۔

"کیا کہہ رہے ہیں کرنل صاحب؟" مرزا چلّایا۔ "دب گئے نقّادوں سے؟ ڈر گئے؟"

"غلطی کے اعتراف کو ڈر نہیں کہتے۔" میں نے مرزا کو سمجھایا۔ "یہ تو حوصلے کی بات ہے۔"

"ذرا ہم بھی تو سنیں کرنل صاحب کس کس جرم کا اقبال کرنا چاہتے ہیں؟"

"جرم نہیں، غلطی۔ یہ تو مرزا تم جانتے ہی ہو کہ انسان سہو و خطا کا پُتلا ہے۔"

"تو پُتلا صاحب۔ ذرا اپنی خطا کی وضاحت تو فرمائیں"۔

"ریحان مرزا۔ بات یہ ہے کہ ہر کام کرتے ہوئے انسان کا کوئی موڈ ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے بسلامت روی کے دیباچے میں ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کے واقعات لکھے جانے سے پہلے کئی دفعہ دوستوں کے حلقے میں سنائے گئے اور ذرا مزے لے لے کر۔ میرے دوست اکثر فوجی افسر تھے۔ بالکل آرمی میس کا ماحول تھا جہاں عورت نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ سو گفتگو میں کچھ بے باکی، کچھ بے اعتدالی، کچھ غیر محتاطی اور بہت سی رنگ آمیزی نارمل سمجھی جاتی ہے۔ اب میس کے انٹی روم میں بیٹھے ہوئے تو یہ بدپرہیزیاں اور رنگ آمیزیاں روا تھیں لیکن غلطی مجھ سے یہ ہو گی کہ کتاب لکھتے وقت وہی کچھ دہرا دیا جو میس میں کہا تھا اور یہ نہ سوچا کہ میس سے باہر کی دنیا میں سارے لوگ فوجی افسر نہیں۔ کچھ پرہیز گار زاہد ہیں، کچھ نیکو کار نقّاد ہیں۔ کچھ پاکباز خواتین ہیں، کچھ پاکدامن پردہ نشین ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں فرنگی باربرائیں اور جوڑیاں وغیرہا نے ایسا محظوظ نہیں کر سکیں۔"

مرزا بولے۔ "جہاں تک مجھے علم ہے۔ خواتین نے تو اپنی فرنگی بہنوں کے ضمن میں کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ مجھے تو ایک نوجوان خاتون لیکچرار نے بتایا کہ کتاب کا مسلسل ہلکے ہلکے رومانس کا ماحول بڑا البھاتا ہے"۔

عرض کیا۔ ”میں تو کہہ رہا ہوں کہ تمام قاری جوان لڑکے یا لڑکیاں نہیں۔ پاکستان میں سنجیدہ بزرگ بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور میں ان تمام سے یہ کہہ کر معذرت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک شوخی کا موڈ تھا جو فرنگ سے واپسی پر ایک عرصہ تک طاری رہا اور بسلامت روی کے بعض حصّے اس شوخی کی زد میں آ گئے۔۔۔ بہر حال یہ میرے مزاج اور کردار کا مستقل رنگ نہیں اور مجھے افسوس ہے کہ یہ رنگ چند حساس بزرگوں کے لئے باعثِ ناخوشی بنا۔۔۔ لیکن اگر کسی کا سچ مچ خیال ہے کہ میں سخت عاشق مزاج اور دِل پھینک قسم کا آدمی ہوں تو بعد از ہزار تسلیمات گزارش ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں اور اسکے گواہ میرے بیشمار دوست ہیں جن میں خواتین بھی شامل ہیں۔ بلکہ سچّی بات تو یہ ہے کہ میری خواتین دوستوں کو تو شکایت ہے کہ کم آمیز ہے مومن! اور پھر ولایت میں تو کسی خاتون سے ہمارا واسطہ چند گھڑیوں سے زیادہ رہا ہی نہیں۔ دفتر میں ملاقات ہوئی یا کھانے پر بات ہوئی، سرِ راہ علیک سلیک ہوئی یا دورانِ سفر چٹ چیٹ[۵۲] ہوئی جو گھڑی دو گھڑی میں تمام ہو گئی اور پروین شاکر کی معتبر شہادت ہے کہ دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں!“

تابش میری گزارشات کو موافق پا کر الزبتھ کے سحر سے تھوڑی دیر کیلئے نکلے اور کہنے لگے۔

---

[۵۲] Chit-Chat چھوٹی موٹی باتیں۔ گپ شپ

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ داغ نے تو اس کارِ خیر کی میعاد کم از کم دو چار ملاقاتیں[۵۳] رکھی ہے۔“

عرض کیا۔ ”تابش میاں میں تو مسلسل سفر میں تھا۔ مجھے تو کسی خاتون سے دوسری ملاقات کا موقع ہی نہ ملا بلکہ بعض اوقات تو تنہائی کی ایسی ڈسنے والی شامیں بھی گزارنا پڑیں کہ بے اختیار فریاد کر اٹھے۔

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام

کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

فیض

تو، اگر اِکا دُکا بے ضرر ملاقات اور زبانی چھیڑ چھاڑ پر نہ پکڑے گئے تو ہمارے نامہ اعمال میں جسمانی چھیڑ چھاڑ اور مشکوک ملاقاتوں کا کوئی واضح اندراج نہیں کہ قابلِ دست اندازی فرشتگان ہو۔ مطلق پاکبازی کا قطعاً دعوی نہیں کہ انسان ہیں۔ تر دامن ہیں لیکن جہاں ہم سے وقتاً فوقتاً چند انسانی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں وہاں ہم نے بارہا ایسی

---

[۵۳] اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں ___ داغ

نیکیاں بھی کی ہیں کہ ملائک رشک کریں۔ لہٰذا جناب شیخ سے التجا ہے کہ ہماری تردامنی پہ نہ جائیو کہ

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہمیں اعتراف ہے کہ جملہ اہلِ دِل کی طرح ہمیں بھی ہر حسین زنانہ چہرے اور ہر ذہن مردانہ دماغ نے کشش کی ہے اور ہم سے خراجِ عقیدت وصول کیا ہے۔ فقط یہ کہ بعض اوقات صنفِ نازک کو ادائیگیٔ خراج کے دوران وارفتگی کے ایسے مقامات بھی آ گئے ہیں جن سے ظاہر بین قارئین کو دھوکہ ہوا ہے کہ شاید کوئی معاشقے کی واردات ہو گئی ہے۔ حالانکہ طرفین کے درمیان خیر سگالی کے ایک بے پایاں جذبہ کے بغیر کچھ نہ تھا۔"

خفقان بولے۔ "جناب قارئین کا قصور نہیں۔ جناب جوش ملیح آبادی کے متعدد، متواتر اور متلذّذ معاشقوں نے انہیں بدگمان کر دیا ہے۔ کسی خاتون کا ذکر آتے ہی یہ چوکنا ہو جاتے ہیں کہ اللہ خیر کرے کچھ ہو نہ جائے۔"

عرض کیا۔ "خفقان بھائی جوش صاحب کے معاشقوں کا جواز تو جناب جوش ہی پیش کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمیں سبزی خور ہی سمجھیں۔ ہم ذکرِ بُتاں کے خوگر ضرور ہیں مگر حرصِ بُتاں کے گرفتار نہیں۔ ہمیں عصمت عزیز ہے۔ اپنی بھی اور

دوسروں کی بھی۔ ہمارا تمام تر عشق دِل و نظر کا عشق ہے۔ آخر وہ آنکھ کیا جو شاہناز، شہر زاد اور غزالہ پر وانہ ہو اور وہ دِل کیا جو چاندنی، گلوں اور نغموں سے بھر نہ آئے۔ وحشت نے بالکل ہمارے دِل کی بات کی ہے۔

چاندنی سے گلوں سے نغموں سے

دِل بھر آتا ہے کیوں خدا جانے"

ہماری اس چھوٹی سی تقریر کا ہمارے دو متحارب دوستوں۔۔۔خارش اور خفقان۔۔۔پر عجیب اثر ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مسکرائے، ہتھیار پھینکے اور آگے بڑھ کر آپس میں ایک والہانہ مصافحہ کیا۔۔۔ ہماری سیٹی نے تیسری جنگِ عظیم روک دی تھی!

## افشائے لطیفہ

بسلامت روی کے صفحہ ۳۷ پر ایک چھوٹا سا پیرا گراف ہے جو درج ذیل ہے۔

"باقی تین منٹ ہم نے امین صاحب سے لطیفے پر لطیفہ سُنا اور اس طرح آئندہ ماہ کے لئے زادِ سفر جمع کر لیا۔ تذکر تاً امین صاحب نے ہم سے پوچھا کہ پنڈی سے لاہور تک سفر کیسا رہا۔ ہم نے کہا۔ ایئر ہوسٹس کے سوا سب خیریت تھی۔ اس پر آپ نے

ائیر ہوسٹسوں کے متعلق ایک نہایت ہی متبرک الوداعی لطیفہ سنایا۔ اگر کبھی آپ سے ملاقات ہو گئی تو یہ لطیفہ زبانی تو سنا سکیں، لیکن افسوس ہماری تحریر اس کی طہارت کی متحمل نہیں ہو سکتی"۔

کتاب چھپنے کے بعد بلامبالغہ سینکڑوں دوستوں بلکہ اجنبیوں نے زبانی اور خطوں کے ذریعے پوچھا کہ آخر یہ کیا لطیفہ ہے؟ اور جب سنایا تو بولے۔ واہ اس میں چھپانے کی کون سی بات تھی؟ بالکل معصوم سا لطیفہ ہے۔ اسے کھلے عام بیان کرو۔ مجھے پھر بھی کچھ جھجک سی تھی مگر جب پیر و مرشد سیّد ضمیر جعفری نے بھی نہ صرف افشائے لطیفہ کی تائید کی بلکہ کسی قدر تاکید بھی کی تو ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور اب یہ رہا لطیفہ۔

ائیر ہوسٹس ہوائی جہاز میں مسافروں میں مشروبات وغیرہ تقسیم کر رہی تھی کہ لاؤڈ سپیکر پر کاک پٹ سے کیپٹن کی آواز گونجی۔

"خواتین و حضرات۔ ہم تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں۔ اس وقت دو بج رہے ہیں۔ انشا اللہ سوا تین بجے ہم قاہرہ کے ہوائی اڈّے پر اُتریں گے۔ امید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزر رہا ہو گا۔" یہاں پہنچ کر کیپٹن لاوڈ سپیکر بند کرنا بھول گیا اور اپنے نائب پائلٹ سے باتیں کرنے لگا جو جہاز کے کیبن میں مسافروں کو سنائی دینے لگیں۔

"پیٹر۔ آؤ اب تم ذرا ہوائی جہاز چلاؤ۔ میں ایک پیالی کافی پیوں گا۔ پھر ائیر ہوسٹس آتی ہے تو اسے ذرا پیار کروں گا اور پھر کچھ دیر آرام کروں گا۔۔۔"

جب ائیر ہوسٹس نے باقی مسافروں سمیت کیپٹن کی باتیں سنیں تو کیپٹن کو یہ بتانے کیلئے کہ لاؤڈ سپیکر بند نہیں، کاک پٹ کی طرف لپکی، مگر تیزی میں ایک بوڑھے مسافر سے ٹکرا کر لڑکھڑا سکی گئی۔ بوڑھے مسافر نے ائیر ہوسٹس کا بازو تھام کر کہا۔

"آہستہ، مس، آہستہ۔ وہ پہلے کافی پئے گا۔"

## مزاح نگاروں کی درجہ بندی

بعض حضرات مزاح نگاروں کی درجہ بندی شروع کر دیتے ہیں۔ کسی نے لکھ دیا کہ ہم آج کل مشتاق احمد یوسفی کے عہد مزاح میں جی رہے ہیں۔ خود یوسفی نے اعلان کر دیا کہ عہدِ حاضر کے سب سے بڑے مزاح نگار ابن انشاء ہیں اور مملکتِ مزاح کا تاج انہی کو زیبا ہے۔ اس پر محمد خالد اختر۔۔۔ جو خود ایک بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔۔۔ کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فرمایا کہ دونوں حضرات کو مل کر فیصلہ کر لینا چاہئے کہ تخت کا والی کون ہے اور پھر جو فیصلہ بھی وہ کریں گے ہم رد کر دیں گے کہ شفیق الرحمان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے بادشاہ کی ضرورت یا گنجائش نہیں۔

میرا خیال ہے تفنّن کی حد تک تو یہ چشمک درست ہے لیکن مزاح نگاروں کو بادشاہوں، وزیروں اور پیادوں میں تقسیم کرنا ایک لاطائل سی مشق ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ گلاب، نرگس اور موتیا کے تازہ و شگفتہ پھول سامنے رکھ کر ان کے درمیان مقابلہ شروع کر دیں۔ آپ شاید گلاب کے ایک پھول کا گلاب کے دوسرے پھول سے تو مقابلہ کر سکتے ہیں مگر تین مختلف قسم کے پھولوں میں مقابلہ بے معنی ہے کہ وہ تینوں حسن اور بو میں بے مثل ہیں اور اپنی اپنی جگہ فطرت کا شاہکار ہیں۔ فطرت کو ہر پھول کی تخلیق پر نوبل پرائز دیا جا سکتا ہے۔

یہی حال ہمارے پہلی صف کے مزاح نگاروں کا ہے کہ اپنے اپنے رنگ میں ہر ایک بے نظیر ہے۔ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کو بادشاہت بخشیں گے تو باقی سب کو بھی مساوی طول و عرض کی بادشاہتیں پیش کرنا پڑیں گی اور ظاہر ہے کہ پاکستان اتنی زیادہ بادشاہتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اسے چند ریاستوں یا امارتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ہر ریاست کسی مزاح نگار کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہے۔ مثلاً قیامِ پاکستان کے وقت ملک پانچ مزاحیہ ریاستوں میں منقسم تھا۔ ملاحظہ فرمائیں نقشہ ۱۹۴۷ء کا۔

ریاست ہائے مزاح ۱۹۴۷ء
نام شمال سے جنوب کو بہ ترتیبِ تہجّی
۱
پطرس
۲
چراغ حسن حسرت
۳
شفیق الرحمٰن
۴
شوکت تھانوی
۵
عبدالمجید سالک
۱
ابنِ انشا
۲
اختر ریاض الدّین
۳
سیّد ضمیر جعفری
۴
شفیق الرحمٰن
۵
صدیق سالک
۶
عطاء الحق قاسمی
۷
محمد خالد اختر
۸
مسعود احمد
۹
مشکور حسین یاد
ریاست ہائے مزاح ۱۹۷۹ء

شمال سے جنوب کو زیب نہیں کئے گئے ہیں

آج یعنی ۱۹۷۹ء کا نقشہ خاصا مختلف ہے۔ ایک کے سوا تمام والیانِ ریاست ہم سے جدا ہو چکے ہیں، لیکن گزشتہ بیس برسوں میں اتنے قابل جانشین پیدا ہوئے ہیں کہ نہ صرف خالی ریاستیں پُر ہو چکی ہیں بلکہ اتنی ہی مزید ریاستیں وجود میں آگئی ہیں۔

ملاحظہ ہو موجودہ نقشہ ۱۹۷۹ء۔

میرے خیال میں یہ دونوں نقشے خود توضیحی (SELF EXPLANATORY) ہیں، لیکن اگر مزید وضاحت درکار ہو تو براہِ کرم بلا تکلّف مجھ سے پوچھیں یا کچھ بتانا چاہئیں تو بتائیں۔

کل کا نقشہ کھینچنا ایک قسم کی پیش گوئی کرتا ہے لیکن چند دعویٰ دار تو اس وقت بھی ریاستی دروازے پر دستک دیتے نظر آرہے ہیں اور یہ ہیں منصور قمر، نظیر صدیقی، نصر اللہ خان، زاہد ملک، مسٹر دہلوی، گلزار وفا چوہدری، نسیمہ بنت

سراج، ارشاد احمد خان، صولت رضاء، کیپٹن اشفاق حسین اور شاید کوئی اور نام[۵۴] بھی ہونگے۔ بے شک اُردُو کے مزاحیہ ادب کا یہ سنہری دور ہے۔

ایک نام جس کی غیر موجودگی شاید آپ نے محسوس کی ہو، مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ مستنصر چاہیں تو آج ہی اسی وقت ایک ریاست الاٹ کرا سکتے ہیں لیکن وہ محض مزاح نگار نہیں کچھ اور بھی ہیں ان کا مزاح ان کی رومانی تحریر میں کچھ اس طرح جذب ہو گیا ہے کہ مجموعی تاثر مزاح کا نہیں رومان اور ادبِ عالیہ کا ہے۔ مستنصر کا نام دراصل ان چند بڑے ناموں سے ہے جو بالا ہتمام مزاح تو نہیں لکھتے لیکن جن سے چھوٹی بڑی نہایت بلیغ مزاحیہ تحریریں وابستہ ہیں۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، ڈاکٹر وزیر آغا، امجد اسلام امجد، اشفاق احمد، مسعود مفتی، انور سدید، غلام جیلانی، اصغر مختار زمن، سلیم اختر، رحیم گُل، مولوی محمد سعید، خدیجہ مستور، رضیہ فصیح احمد، زہرہ جبیں، نثار عزیز بٹ، اختر جمال، سلمیٰ یاسمین نجمی الغرض اس ضمن میں صفِ اوّل

---

[۵۴] اگر کسی دعویٰ دار مزاح نگار کا نام رہ گیا ہو تو اسے مصنّف کی لاعلمی سمجھیں نہ کہ بدنیّتی۔ اس صورت میں براہِ کرم مزاح نگار خود یا ان کا کوئی دوست ان کے نام یا ان کی تصنیفات سے اطلاع بخشے۔ اگلے ایڈیشن میں تلافی کر دی جائے گی۔ مجھے خاص طور پر نوجوان مزاح نگاروں کی تخلیقات سے دلچسپی ہے۔ مختلف اوقات پر رسائل میں میری نگاہ سے خواتین کے بھی چند نہایت دلچسپ مضامین گزرے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے ان کا ریکارڈ نہ رکھ سکا۔ ازراہِ کرم ایسی تحریروں کا بھی پتہ دیجئے گا۔ (مصنّف)

کے بیشتر ادیبوں کے نام[۵۵] لئے جا سکتے ہیں۔ ان سب نے خالص مزاحیہ مضامین تو نہیں لکھے یا کم لکھے ہیں، لیکن ان کی سنجیدہ تحریروں میں بھی مزاح کی ایک زیریں لہر (UNDER-CURRENT) محسوس کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی شہرت، ان کے مزاح کی مرہون نہیں۔ مزاح کی تحریروں کا ایک دلآویز بونس ہے۔

میں نے مزاح نگاروں میں شاعروں کا نام نہیں لیا سوائے ان شاعروں کے جن کا بحیثیت نثر نگار بھی ایک مقام ہے۔ میں مزاح نگار شاعروں کے فکر و فن کا قائل بلکہ مداح ہوں مگر ان کی ریاستوں یا امارات کا تعین کوئی شاعر ہی کریگا۔

## خداحافظ

بقول شیکسپئر دنیا ایک سٹیج ہے جس پر ہر شخص آتا ہے، مختصراً اپنا پارٹ ادا کرتا ہے اور فیڈ آؤٹ (FADE OUT) ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ کیلئے! اس برصغیر کی سٹیج پر کئی نامور ایکٹر آئے، میر، غالب، اقبال جو نہ صرف شعلہ جوالہ کی صورت چمکے بلکہ ایک مستقل روشنی چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ اسی سٹیج کے فکاہی کرداروں میں اکبر الہ آبادی اور

---

[۵۵] ان تمام خواتین و حضرات سے معذرت کے ساتھ جن کا کام محض خوفِ طوالت کی وجہ سے نہیں لکھ پایا۔ لیکن یقین جانیں کہ اگر آپ کا نام کاغذ پر نہیں لکھ سکا تو برلوحِ سینۂ نام تو صد جا نوشتہ ایم! (مصنّف)

پطرس تھے۔ یہ وہ شہابِ ثاقب تھے جن کی روشنی سے برصغیر آج تک منوّر ہے۔ اسی سٹیج پر کم و بیش روشنی کے ساتھ پچھلے دنوں فرحت اللہ بیگ، فہیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی آئے۔ موجودہ زمانے میں شفیق الرحمان، سیّد ضمیر جعفری، یوسفی، ابن انشاء، اختر ریاض الدین، محمد خالد اکتر، کنہیا لال کپور اور متعدد دوسرے مزاح نگار ماہتابیاں اور انار روشن کئے سٹیج کے فرنٹ پر قطار باندھے کھڑے ہیں اور ان کی پیدا کردہ رنگ برنگی روشنیوں سے دنیائے اُردُو میں میلے کا سا سماں ہے۔ مجھے ہزار خواہش کے باوجود پہلی صف میں تو جگہ نہیں مل سکی لیکن سٹیج کے پچھلے کنارے سے لگ کر ایک چھوٹی سی پھلجھڑی چھڑانے کا موقع مل گیا ہے۔ کچھ تماشائیوں تک اس کی روشنی پہنچ گئی ہے مگر اکثر کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں اور وہ ہو بھی نہیں سکتا کہ میرے آگے کھڑے ہوئے قد آور لوگوں نے ایک خیرہ کُن آتشبازی سے ہال روشن کر رکھا ہے۔ مجھے فقط یہ اطمینان ہے کہ ایک لمحے کیلئے میری ناتواں پھلجھڑی نے بھی چند تارے پیدا کئے ہیں۔ یہ کتاب اسی پھلجھڑی کا ایک تارا ہے۔ اور غالباً آخری تارا۔ اور اب اس سٹیج سے رخصت ہونے کا وقت ہے۔۔۔

سو، قاری خدا حافظ۔